

اللہ کی بنائی ہوئی تقدیر

کو اس قدر دور ہونا چاہیے کیونکہ جس نظام کو جس تدبیر و تقدیر کے ساتھ انہوں نے دیکھا ہے، اس نظام کے مطابق ان کا فاصلہ اس قدر دور ہونا چاہیے۔ اس کے بعد جب انہوں نے تیز دور بینوں سے مشاہدہ کیا تو معلوم ہوا کہ انہوں نے تقدیر کے مطابق یعنی اندازے کے مطابق جو فاصلے طے کیے تھے وہ درست نکلے۔ غرض ان اجرام فلکی کو اس عظیم فضا میں ایسے متعین فاصلوں سے رکھنا جن کے اندر کوئی تغیر اور تبدل نہیں ہو رہا ہے اور کوئی اضطراب نہیں، اس بات کی دلیل ہے کہ اللہ نے ہر چیز کو ایک مقررہ قدر یا مقدار یا تقدیر کے ساتھ بنایا ہے۔

یہ زمین جس کے اوپر ہم رہتے ہیں، اس کے اندر پائے جانے والے رزق اور تقدیر کا علم تو اس قدر بڑھ گیا ہے کہ اس کی موجودہ حالت اور ہیئت اور نسبت کے اندر اگر ذرا بھی تبدیلی کی جائے تو اس زمین پر جس قدر متنوع زندگی پائی جاتی ہے اس کے اندر زبردست خلل واقع ہو جائے یا سرے سے زندگی ہی ختم ہو جائے۔ اس زمین کا حجم اور اس کا ڈھیر اور اس کی سورج سے دوری اور اس کا حجم اس کا درجہ حرارت اور اپنے محور پر زمین کا جھکاؤ، اس کی گردش محوری کی رفتار، چاند کا زمین سے فاصلہ، چاند کا حجم اور اس کا مواد اور زمین کی تقسیم پانی اور خشکی میں اور اس کی نسبت، غرض یہ اور اسی قسم کی دوسری ہزاروں نسبتیں ایسی ہیں جن کو دست قدرت نے برابر مقدر کیا ہے۔ ان میں اگر ذرا بھی تبدیلی ہو جائے تو تمام موجودہ نظام بدل جائے اور زمین پر سے زندگی فوراً ختم ہو جائے اور وہ ضوابط جو زندگی کو کنٹرول کرتے ہیں ان کے درمیان توازن کا ادراک اس حد تک پہنچ گیا ہے کہ زندہ اشیاء اور ان کے ماحول کے درمیان توازن اور تمام اشیاء کا ایک دوسرے کے ساتھ توازن اس حد تک پہنچا ہوا ہے اور انسانوں کو معلوم ہو گیا جس طرح اس آیت کے اندر پائی جانے والی حقیقت کی طرف اشارات اچھی طرح ملتے ہیں۔ چنانچہ

إِنَّا كُلَّ شَيْءٍ خَلَقْنَاهُ بِقَدَرٍ ﴿۵۴﴾ (۴۹:۵۴) ”ہم نے ہر چیز تقدیر کے ساتھ پیدا کی ہے۔“ ہر چیز چھوٹی ہو یا بڑی ہو، بولنے والی ہو یا خاموش، متحرک ہو یا ساکن، گزری چیز یا حاضر، معلوم چیز یا مجہول، اللہ نے ہر چیز کو ایک اندازے سے پیدا کیا ہے۔

یہ تقدیر اس کی حقیقت طے کرتی ہے۔ اس کی صفت طے کرتی ہے۔ اس کا زمانہ طے کرتی ہے۔ اس کا مکان طے کرتی ہے۔ اس کے ماحول کے ساتھ اس کے روابط طے کرتی ہے۔ اس کائنات میں اس کے اثرات طے کرتی ہے۔ یہ قرآنی آیت چند مختصر الفاظ پر مشتمل ہے لیکن یہ آیت ایک عظیم اور مجیر العقول حقیقت کی طرف اشارہ کر رہی ہے۔ اس آیت کے مفہوم میں یہ پوری کائنات شامل ہے۔ اس حقیقت کو انسان کا دل تب ہی پاسکتا ہے جب وہ اس پوری کائنات کو ذہن میں رکھے۔ وہ اس کائنات کے ساتھ ہم قدم ہو۔ اس سے حقائق اخذ کرے اور یہ محسوس کرے کہ یہ کائنات باہم تناسب اور نہایت ہی دقت کے ساتھ باہم مربوط مخلوق ہے۔ اس کی ہر چیز ایک مقدار کے مطابق پیدا کی گئی ہے۔ تب اس حقیقت کا ایک سایہ اور ایک خاکہ ذہن میں بیٹھ جائے گا۔ صرف ایک چیز کو ذہن میں رکھنے سے یہ تصور نہیں آسکتا۔

جدید سائنس نے اس حقیقت کے بعض نہایت ہی معمولی شعبوں کا احاطہ کیا ہے۔ یہ علم جدید سائنس نے اپنے محدود وسائل کے مطابق فراہم کیا ہے۔ سائنس نے معلوم کر لیا ہے کہ ستاروں کے درمیان فاصلے ایک متعین مقدار کے مطابق ہیں۔ سیارے اور ان کے حجم اور ستاروں اور سیاروں کے گروپ یعنی کہکشاں اور ان کی ایک دوسرے کے ساتھ کشش، یہ مقدریں اور فاصلے اس قدر متعین ہو گئے ہیں کہ سائنس دانوں نے ایسے ستاروں کے فاصلے بھی متعین کر دیے ہیں جن کو انہوں نے دیکھا نہیں ہے کیونکہ کشش اور ہم آہنگی کا تقاضا یہ تھا کہ ان ستاروں

عوامل حیات اور بقائے حیات کے عوامل اور موت اور فنا کے عوامل کے درمیان نسبت بھی معاشرے میں متعین ہے اور جب کوئی زندہ مخلوق اپنے حدود سے تجاوز کر جاتی ہے تو زندگی کو کنٹرول کرنے والے قدرتی ضوابطِ خدا سے چپک کرتے ہیں تاکہ جس قدر زندہ مخلوق ہو، ان کی ضروریات کو پورا کیا جاسکے۔

یہاں اس طرف اشارہ کرنا ضروری ہے کہ بعض زندہ اشیاء کا بعض دوسری زندہ اشیاء کے ساتھ بھی تعلق اور توازن ہے جبکہ زمین کے اندر موجود توازن کی طرف ہم اس سے قبل اشارہ کر چکے ہیں (سورت الفرقان کی تشریح)۔

وہ پرندے جو چھوٹے پرندوں کا شکار کر کے غذا حاصل کرتے ہیں، وہ قلیل التعداد ہیں۔ اس لیے کہ یہ بہت کم انڈے دیتے ہیں۔ پھر بہت کم بچے دیتے ہیں اور پھر یہ محدود اور متعین علاقوں میں زندہ رہتے ہیں اور دوسرے پرندوں کے مقابلے میں ان کی عمر طویل ہوتی ہے۔ اگر طویل عمر کے ساتھ ساتھ ان کے بچے بھی زیادہ ہوتے اور یہ ہر علاقے میں زندہ رہ سکتے تو وہ دنیا سے تمام چھوٹے پرندوں کو ختم کر دیتے اور چھوٹے پرندوں کی نسلیں ختم ہو جاتیں یا ان کی تعداد اس قدر قلیل ہو جاتی کہ جس مقصد کیلئے اللہ نے ان کو پیدا کیا تھا یعنی لوگوں کا شکار اور کھانا اور دوسرے بے شمار مقاصد جو زمین پر وہ سرانجام دیتے ہیں وہ پورے نہ ہوتے، کسی نے کیا خوب کہا ہے:

بغاث الطیر اکثر ہا فراخا
وام الصفر مقلّۃ نزور

(بغاث آبی پرندہ، کے بچے بہت ہوتے ہیں لیکن شاہین کی ماں بہت کم اور تھوڑے بچے دیتی ہے۔)

یہ بھی اللہ کی حکمت اور تقدیر ہے جیسا کہ ہم نے دیکھا تا کہ قدرتی نظام بگڑ نہ جائے، تاکہ پرندوں کی پیدائش اور ان کی بقا اور گوشت خور پرندوں کے ذریعہ ان کے فائدے میں توازن پیدا ہو۔ کبھی کئی ملین انڈے دیتی ہے لیکن اس کی عمر صرف دو ہفتے ہوتی ہے۔ اگر یہ کئی سال تک زندہ رہتی اور انڈے اسی نسبت سے دیتی تو مکھیاں تھوڑے ہی عرصہ میں زمین کو

ڈھانپ لیتیں اور کئی دوسرے زندہ جانور بلکہ انسان محروم ہو جاتے یا ان کی زندگی سطحِ ارض پر مشکل ہو جاتی لیکن قدرت کا نظام توازن کا کام کر رہا ہے اور یہ توازن اللہ کے ہاتھ میں ہے۔ اگر کسی چیز کی نسل زیادہ ہے تو عمر کم رکھی گئی ہے اور اگر نسل کم ہے تو عمر زیادہ دی گئی ہے اور یہ چیز ہم حیات کے تفصیلی مکالمے میں پیش کرنا چاہتے ہیں۔

وہ حیوانات جو مائیکروسکوپ سے نظر آتے ہیں، تمام زندہ چیزوں سے تعداد میں زیادہ ہوتے ہیں اور پھیلاؤ میں بڑی کثرت سے پھیلتے ہیں اور بہت زیادہ نقصان دہ ہوتے ہیں لیکن یہ زندگی کو قائم رکھنے میں بہت کمزور اور عمر کے لحاظ سے بہت کم عمر ہوتے ہیں۔ یہ ملین اور بلین کے حساب سے تو سردی سے مر جاتے ہیں، گرمی سے مر جاتے ہیں، سورج کی شعاعوں سے مر جاتے ہیں، جراثیم کش ادویات وغیرہ سے اور دوسرے اسباب و ذرائع سے، اور یہ چیزیں انسانوں اور حیوانوں کی ایک محدود تعداد کو نقصان دے سکتی ہیں۔ اگر یہ چیزیں طاقتور ہوتیں یا زیادہ عمر پاتیں تو زندہ چیزوں اور انسانوں کیلئے خطرہ بن جاتیں۔

اللہ نے ہر زندہ چیز کو اپنے دشمنوں سے بچاؤ کے لیے ہتھیار دیئے ہیں اور یہ ہتھیار حسب ضرورت ہر چیز کے لیے الگ ہے۔ مثلاً کسی کو تعداد میں کثرت کا اسلحہ دیا گیا ہے، کسی کو گرفت کی قوت دی گئی ہے اور کسی کو کیا، کسی کو کیا۔

چھوٹے سانپوں کو زہر دیا گیا ہے یا بڑی سرعت سے بھاگنے کا ہتھیار۔ ناگوں کو بڑے بڑے عضلاتی ہتھیار دیئے گئے ہیں۔ اس لیے ان میں زہر شاذ و نادر ہی ہوتا ہے اور گہریلا اپنے آپ کو بچانے سے عاجز ہوتا ہے اس لئے اسے ایک ایسا مادہ دیا گیا ہے جو داغ دیتا ہے اور بدبودار ہوتا ہے جو بھی اسے چھوتا ہے اس پر وہ یہ مواد بکھیر دیتا ہے اس طرح وہ دشمنوں سے اپنے آپ کو بچتا ہے۔

وہ انڈہ جس میں نطفہ داخل ہو جاتا ہے، رحمِ مادر کے ساتھ چٹ جاتا ہے۔ یہ رحمِ مادر کو کھانا شروع کر دیتا ہے اور اپنے ارد گرد رحمِ مادر میں ایک گڑھا بنا دیتا ہے جو خون سے بھر جاتا ہے اور یہ اس میں زندہ رہتا ہے اور خون کو چوستا رہتا ہے اور وہ نالی جو رحمِ مادر سے بچے کی ناف سے ملتی

ہے، وضع حمل تک خون دیتی رہتی ہے اور یہ اسی مقصد کے لیے پیدا کی جاتی ہے۔ یہ نالی نہ لمبی ہوتی ہے اور نہ چھوٹی ہوتی ہے اور اس مقدار میں اس کی لمبائی مقدار ہے کہ مقصد کو اچھی طرح پورا کرتی ہے۔

حمل کے آخری دس دنوں میں پستانوں کے اندر ایک مواد بننا شروع ہوتا ہے اور وضع حمل کے بعد زردی مائل مواد (دودھ) نکلتا ہے۔ اللہ کی صنعت کے کاریگروں کو دیکھو کہ اس کے اندر وہ مواد ہوتا ہے جو بچے کو متعدد امراض سے بچاتا ہے اور بچے کی پیدائش کے دوسرے دن دودھ نکلنا شروع ہوتا ہے اور قدرت کا انتظام دیکھئے کہ دودھ میں آہستہ آہستہ اضافہ ہوتا ہے۔ ایک سال کے بعد یہ ڈیڑھ لیٹر تک پہنچ جاتا ہے، حالانکہ ابتدائی دنوں میں اس کی مقدار کم ہوتی ہے۔ صرف یہ اعجاز نہیں ہے کہ بچے کے بڑے ہونے کے ساتھ ساتھ دودھ ہی بڑھتا ہے بلکہ دودھ کی ترکیب میں بھی تبدیلی ہوتی ہے۔ آغاز میں یہ محض پانی اور شکر ہوتا ہے اور اس کے بعد اس میں دوسرے ضروری مادے زیادہ ہوتے جاتے ہیں اور پھر اس میں تیل بھی آتا ہے بلکہ ہر دن کا دودھ دوسرے دن سے مختلف ہوتا ہے اور یہ بچے کی ضروریات نشوونما کے مطابق ہوتا جاتا ہے۔

انسان کی نشوونما میں بے شمار مشینیں کام کرتی ہیں۔ انسان کے فرائض، اس کے طریقہ عمل میں بہت سے عوامل لگے ہوئے ہیں جو اس کی زندگی کو بچاتے ہیں اور صحت کے محافظ ہیں اور یہ فیکٹریاں جو انسانی جسم کے اندر لگی ہوئی ہیں، ان کے بارے میں عجیب اور حیران کن معلومات حاصل ہو چکی ہیں۔ ان سے معلوم ہوتا ہے کہ دست قدرت نے کس قدر باریک نظام وضع کیا ہے اور اس کی تدبیریں ہو رہی ہیں اور جن سے صاف صاف نظر آ رہا ہے کہ اللہ کا نظام کام کر رہا ہے۔ ہر فرد، ہر عضو کیلئے یہ عوامل کام کرتے ہیں بلکہ ہر خلیے کے لیے کام ہو رہا ہے اور اللہ کی نظر سے کوئی چیز غائب نہیں ہے۔ ہم یہاں انسانی جسم کی ساخت اور اس کے پیچیدہ نظام کی تفصیلات تو نہیں دے سکتے لیکن بطور نمونہ ہم صرف ایک نظام کی طرف مختصر اشارہ کرتے ہیں۔ یہ سخت غدودوں کا نظام ہے۔ یہ جسم کے اندر چھوٹی چھوٹی فیکٹریاں ہیں جو جسم کو ضروری

کیمیائی مواد فراہم کرتی ہیں۔ ان کی قوت یہ ہے کہ اس کے ایک ہزار بلین اجزاء میں سے ایک جزو بھی اس قدر مواد پیدا کرتا ہے جو جسم انسان کے لیے بہت اہم ہوتا ہے اور اس کا نظام اس طرح بنایا گیا کہ ایک غدود کا مواد دوسرے غدود کے مواد کے لیے لازمی جزو ہوتا ہے اور ان کے بارے میں آج تک جو کچھ معلوم ہوا ہے، وہ یہ ہے کہ ان کا نظام نہایت ہی پیچیدہ ہے اور اگر ان میں کسی ایک غدود میں خلل واقع ہو جائے تو انسانی جسم میں عموماً تباہی کا عمل شروع ہو جاتا ہے، اگرچہ یہ خلل ایک مختصر وقت کے لیے ہو۔

(جاری ہے)



توبہ واستغفار کے آداب

ہیں جو بہت زیادہ توبہ کرنے والے ہیں۔“ (ترمذی)
قرآن پاک میں خدا نے اپنے پیارے بندوں کی یہ امتیازی خوبی بیان فرمائی ہے کہ وہ سحر کے اوقات میں خدا کے حضور گرگڑاتے ہیں اور توبہ واستغفار کرتے ہیں اور مومنوں کو تلقین فرمائی ہے کہ وہ توبہ واستغفار کرتے رہیں اور یہ یقین رکھیں کہ خدا ان کے گناہوں پر عفو و درگزر کا پردہ ڈال دے گا اس لئے کہ وہ بڑا ہی معاف فرمانے والا اور اپنے بندوں سے انتہائی محبت کرنے والا ہے۔ (ہود: ۹۰)

”اور اپنے پروردگار سے مغفرت چاہو اور اس کے آگے توبہ کرو۔ بلاشبہ میرا رب بڑا ہی رحم فرمانے والا اور بہت ہی محبت کرنے والا ہے۔“
2- خدا کی رحمت سے ہمیشہ پر امید رہیے اور یہ یقین رکھیے کہ میرے گناہ خواہ کتنے ہی زیادہ ہوں خدا کی رحمت اس سے کہیں زیادہ وسیع ہے۔ سمندر کے جھاگ سے زیادہ گناہ کرنے والا بھی جب اپنے گناہوں پر شرمسار ہو کر خدا کے حضور گرگڑاتا ہے تو خدا اس کی سنتا ہے اور اس کو اپنے دامن رحمت میں پناہ دیتا ہے۔

”اے میرے وہ بندو! جو اپنی جانوں پر زیادتی کر بیٹھے ہو۔ خدا کی رحمت سے ہرگز مایوس نہ ہونا یقیناً خدا تمہارے سارے کے سارے گناہ معاف فرما دے گا وہ بہت ہی معاف فرمانے والا اور بڑا ہی مہربان ہے اور تم اپنے رب کی طرف رجوع کرو اور اس کی فرمانبرداری بجالاؤ اس سے پہلے کہ تم پر کوئی عذاب آپڑے اور پھر تم کہیں سے مدد نہ پاسکو۔“ (الزمر: ۵۳، ۵۴)

3- زندگی کے کسی حصے میں گناہوں پر شرمساری اور ندامت کا احساس پیدا ہوا ہے خدا کی توفیق سمجھئے اور توبہ کے دروازے کو کھلا سمجھیے۔ خدا اپنے بندوں کی توبہ اس وقت تک قبول فرماتا ہے جب تک ان کی

1- توبہ کی قبولیت سے کبھی مایوس نہ ہوں، کیسے ہی بڑے بڑے گناہ ہو گئے ہوں توبہ سے اپنے نفس کو پاک کیجیے اور خدا سے پر امید رہیے، مایوسی کا فروں کا شیوہ ہے۔ مومنوں کی تو امتیازی خوبی یہ ہے کہ وہ بہت زیادہ توبہ کرنے والے ہوتے ہیں اور کسی حال میں خدا سے مایوس نہیں ہوتے۔ گناہوں کی زیادتی سے گھبرا کر مایوسی میں مبتلا ہونا اور توبہ کی قبولیت سے ناامید ہونا ذہن و فکر کی تباہ کن گمراہی ہے۔ خدا نے اپنے محبوب بندوں کی یہ تعریف نہیں فرمائی ہے کہ ان سے گناہوں کا صدور نہیں ہوتا بلکہ فرمایا ان سے گناہ ہوتے ہیں لیکن وہ اپنے گناہوں پر اصرار نہیں کرتے۔ صفائی سے ان کا اعتراف کرتے ہیں اور خود کو پاک کرنے کیلئے بے چین ہوتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے قرآن پاک میں ارشاد فرمایا۔

ترجمہ! ”اور اگر کبھی ان سے کوئی فحش کام سرزد ہو جاتا ہے یا وہ اپنے اوپر کبھی زیادتی کر بیٹھتے ہیں تو معاذ انہیں خدا یاد آ جاتا ہے اور وہ اس سے اپنے گناہوں کی معافی چاہتے ہیں اور خدا کے سوا کون ہے جو گناہوں کو معاف کر سکتا ہے؟ اور وہ جانتے بوجھتے اپنے کیے پر ہرگز اصرار نہیں کرتے۔“ (آل عمران: ۱۳۵)

اور دوسرے مقام پر فرمایا:

”فی الحقیقت جو لوگ خدا سے ڈرنے والے ہیں ان کا حال یہ ہوتا ہے کہ کبھی شیطان کے اثر سے کوئی برا خیال اگر نہیں چھو بھی جاتا ہے تو وہ فوراً چوکنے ہو جاتے ہیں اور پھر انہیں صاف نظر آنے لگتا ہے کہ صحیح روش کیا ہے۔“ (الاعراف: ۳۰)

اور نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

”سارے کے سارے انسان خطا کار ہیں اور بہترین خطا کار وہ

سانس نہیں اکھڑتی، البتہ سانس اکھڑنے کے بعد جب انسان دوسرے عالم میں جھانکنے لگتا ہے تو توبہ کی گنجائش ختم ہو جاتی ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد ہے:

”خدا اپنے بندے کی توبہ قبول کرتا ہے مگر سانس اکھڑنے سے پہلے پہلے۔“ (ترمذی)

حضرت یوسف علیہ السلام کے بھائیوں نے ان کو اندھیرے کنویں میں دھکیل کر اپنی دانست میں انہیں ختم کر دیا۔ گویا وہ نبی کے قتل کا گناہ کر بیٹھے اور ان کا گرتا خون میں رنگ کر اپنے باپ یعقوبؑ کو یقین دلانے کی کوشش کرنے لگے کہ یوسفؑ مر گئے اور ان کو بھیڑیے نے اپنی غذا بنالیا، لیکن ایسے عظیم گناہ کا ارتکاب کرنے کے کئی سال بعد جب ان میں اپنے جرم کا احساس ابھرتا ہے اور وہ شرمسار ہو کر اپنے والد سے درخواست کرتے ہیں کہ ابا جان! ہمارے لئے خدا سے دعا کیجئے کہ خدا ہمارے گناہ کو معاف فرمادے تو خدا کے پیغمبر حضرت یعقوب علیہ السلام یہ کہہ کر انہیں مایوس نہیں کرتے کہ تمہارا گناہ بہت عظیم ہے اور اس عظیم ترین گناہ پر اب برسوں گزر چکے ہیں، لہذا اب معافی کا کیا سوال؟ بلکہ وہ ان سے وعدہ کرتے ہیں کہ میں ضرور تمہارے لئے اپنے پروردگار سے دعائے مغفرت کروں گا اور انہیں یقین دلاتے ہیں کہ خدا ضرور تمہیں معاف فرمادے گا اس لئے کہ وہ بہت زیادہ درگزر کرنے والا اور بڑا ہی رحم فرمانے والا ہے۔ ”ان سب نے کہا، ”اے ابا جان! ہمارے گناہوں کی بخشش کیلئے دعا کیجئے۔ واقعی ہم بڑے خطا کار تھے۔“ (یوسف: ۹۷)

”حضرت یعقوبؑ نے کہا: میں اپنے رب سے تمہارے لئے ضرور معافی کی دعا کروں گا۔ (اور وہ تمہیں ضرور معاف فرمادے گا) یقیناً وہ بڑا ہی معاف کرنے والا اور انتہائی رحم فرمانے والا ہے۔“ (یوسف: ۹۸)

اور نبی ﷺ نے امت کو مایوسی کی تباہی سے بچانے کیلئے صحابہؓ کو ایک عجیب و غریب قصہ سنایا جس سے یہ سبق ملتا ہے کہ مومن عمر کے جس حصے میں بھی اپنے گناہوں پر شرمندہ ہو کر سچے دل سے خدا کے حضور گڑ گڑائے گا تو وہ اسے اپنے دامن مغفرت میں ڈھانپ لے گا اور

کبھی نہیں دھتکارے گا۔

نبی ﷺ نے فرمایا کہ پچھلی قوم میں ایک شخص تھا۔ جس نے ننانوے خون کئے تھے اس نے لوگوں سے معلوم کیا کہ دنیا میں سب سے بڑا عالم کون ہے؟ لوگوں نے اس کو ایک خدا رسیدہ راہب کا پتہ دیا۔ وہ اس راہب کے پاس گیا اور بولا۔

حضرت! میں نے ننانوے خون کئے ہیں کیا میری توبہ بھی قبول ہو سکتی ہے؟

راہب نے کہا نہیں تمہاری توبہ قبول ہونے کی اب کوئی صورت نہیں۔ یہ سنتے ہی اس شخص نے مایوسی میں اس راہب کو بھی قتل کر دیا اور وہ اب پورے سوا فرد کا قاتل تھا۔ اب اس نے پھر لوگوں سے دریافت کرنا شروع کیا کہ روئے زمین میں دین کا سب سے بڑا عالم کون ہے۔ لوگوں نے اس کو ایک اور راہب کا پتہ دیا۔ اب وہ توبہ کی غرض سے اس راہب کی خدمت میں پہنچا اور اس کو اپنی حالت بتاتے ہوئے کہا کہ حضرت! میں نے سوتل کئے ہیں۔ یہ بتائیے کیا میری توبہ قبول ہو سکتی ہے؟ اور میری بخشش کی بھی کوئی صورت ہے۔ راہب نے کہا کیوں نہیں۔ بھلا تمہارے اور توبہ کے درمیان میں کون سی چیز رکاوٹ بن سکتی ہے، تم فلاں ملک میں جاؤ۔ وہاں خدا کے کچھ برگزیدہ بندے خدا کی عبادت میں مصروف ہیں تم بھی ان کے ساتھ خدا کی عبادت میں لگ جاؤ اور پھر کبھی اپنے وطن میں لوٹ کر نہ آنا کیونکہ اب یہ جگہ دینی لحاظ سے تمہارے لئے مناسب نہیں ہے (یہاں تمہارے لئے توبہ پر قائم رہنا اور اصلاح حال کی کوشش کرنا بہت مشکل ہے) وہ شخص روانہ ہوا۔ ابھی آدھے راستے تک ہی پہنچا تھا کہ موت کا پیغام آ گیا۔ اب رحمت اور عذاب کے فرشتے باہم جھگڑنے لگے۔ رحمت کے فرشتوں نے کہا، یہ گناہوں سے توبہ کر کے اور خدا کی طرف متوجہ ہو کر ادھر آیا ہے عذاب کے فرشتوں نے کہا، نہیں! ابھی اس نے کوئی بھی نیک عمل نہیں کیا ہے۔ یہ باتیں ہو رہی تھیں کہ ایک فرشتہ انسان کی صورت میں آیا۔ ان فرشتوں نے اس کو اپنا حکم بنالیا کہ وہ ان دونوں کے درمیان کوئی فیصلہ کر دے۔ اس نے کہا دونوں طرف کی زمین ناپواور دیکھو کہ وہ جگہ یہاں سے قریب

اس کی کوشش کی بھی کوئی قیمت نہ لگے گی اور وہ دھتکار دیا جائے گا۔ رسول ﷺ بھی خدا کا بندہ ہے اور وہ بھی اسی در کا فقیر ہے اسے بھی جو عظیم مرتبہ ملا ہے اسی در سے ملا ہے اور اس کی عظمت کا راز بھی یہی ہے کہ وہ خدا کا سب سے زیادہ عاجز بندہ ہوتا ہے اور عام انسانوں کے مقابلہ میں کہیں زیادہ خدا کے حضور گڑ گڑاتا ہے۔ نبی ﷺ کا ارشاد ہے!

”لوگو! خدا سے اپنے گناہوں کی معافی چاہو اور اس کی طرف پلٹ آؤ مجھے دیکھو میں دن میں سو سو بار خدا سے مغفرت کی دعا کرتا ہوں۔“ (مسلم)

منافقوں کا ذکر کرتے ہوئے خدا تعالیٰ نے فرمایا:

”یہ منافقین آپ کے سامنے قسمیں کھائیں گے کہ آپ ان سے راضی ہو جائیں اگر آپ ان سے راضی ہو گئے تو خدا ہرگز ایسے بے دینوں سے راضی نہ ہوگا۔“ (توبہ: ۹۶)

قرآن پاک میں حضرت کعب بن مالکؓ کا عبرت انگیز واقعہ ہمیشہ کیلئے سبق ہے کہ بندہ سب کچھ سہمے، ہر آزمائش برداشت کرے لیکن خدا کے در سے اٹھنے کا تصور تک دل میں نہ لائے، دین کی راہ میں آدمی پر جو کچھ بیٹے اور خدا کی طرف سے اس کو جتنا بھی روندنا جائے وہ اس کی زندگی کو چکانے اور اس کے درجات کو بلند کرنے کا ذریعہ ہے۔ یہ بے عزتی دائمی عزت کا یقینی راستہ ہے اور جو خدا کے دروازے کو چھوڑ کر کہیں اور عزت تلاش کرتا ہے اس کو کہیں بھی عزت میسر نہیں آسکتی۔ وہ ہر جگہ ذلیل ہوگا اور زمین و آسمان کی کوئی ایک آنکھ بھی اس کو عزت کی نظر سے نہیں دیکھ سکتی۔

”اور ان تینوں کو بھی خدا نے معاف کر دیا جن کا معاملہ ملتوی کر دیا گیا تھا جب زمین اپنی ساری وسعتوں کے باوجود ان پر تنگ ہو گئی اور ان کی جانیں بھی ان پر بار ہوئے لگیں اور انہوں نے جان لیا کہ خدا سے بچنے کیلئے کوئی پناہ گاہ نہیں ہے سوائے اس کے خود اسی کی پناہ لی جائے تو خدا اپنی مہربانی سے ان کی طرف پلٹا تا کہ وہ اس کی طرف پلٹ آئیں بلاشبہ وہ بڑا معاف فرمانے والا اور انتہائی مہربان ہے۔“ (التوبہ: ۱۱۸)

ان تینوں بزرگوں سے حضرت کعب بن مالکؓ، حضرت مرارہ بن

ہے جہاں سے یہ شخص آیا ہے یا وہ جگہ یہاں سے قریب ہے جہاں اس شخص کو جانا تھا فرشتوں نے زمین کو ناپا تو وہ جگہ قریب نکلی جہاں اس شخص کو جانا تھا اور جاتے ہوئے راہ میں فرشتہ رحمت نے اس کی روح قبض کر لی اور خدا نے اس کو بخش دیا۔ (بخاری، مسلم)

4- صرف خدا کے حضور اپنے گناہوں کا اقرار کیجئے، اسی کے حضور گڑ گڑائیے اور اسی کے سامنے اپنے عاجزی، بے کسی اور خطا کاری کا اظہار کیجئے۔ عجز و انکساری انسان کا وہ سرمایہ ہے جو صرف خدا ہی کے حضور پیش کیا جاسکتا ہے اور جو بد نصیب اپنے عجز و احتیاج کا یہ سرمایہ اپنے ہی جیسے مجبور و بے بس انسانوں کے سامنے پیش کرتا ہے تو پھر اس دیوالیہ کے پاس خدا کے حضور پیش کرنے کیلئے کچھ نہیں رہ جاتا اور ذلیل و رسوا ہو کر ہمیشہ کیلئے درد کی ٹھوکریں کھاتا ہے اور کہیں عزت نہیں پاتا۔ خدا کا ارشاد ہے!

”اور آپ کا پروردگار گناہوں کو ڈھانپنے والا اور بہت زیادہ رحم فرمانے والا ہے اگر وہ ان کے کرتوتوں پر ان کو فوراً پکڑنے لگے تو عذاب بھیج دے مگر اس نے (اپنی رحمت سے) ایک وقت ان کیلئے مقرر کر رکھا ہے اور یہ لوگ بچنے کیلئے اس کے سوا کوئی پناہ گاہ نہ پائیں گے۔“ (الکہف: ۵۸)

اور سورۃ شوریٰ میں ہے!

”اور وہی تو ہے جو اپنے بندوں کی توبہ قبول کرتا ہے اور ان کی خطاؤں کو معاف فرماتا ہے اور وہ سب جانتا ہے جو تم کرتے ہو۔“ (شوریٰ: ۲۵)

دراصل انسان کو یہ یقین رکھنا چاہیے کہ فوز و فلاح کا ایک ہی دروازہ ہے۔ اس دروازہ سے جو دھتکار دیا گیا پھر وہ ہمیشہ کیلئے ذلیل اور محروم ہو گیا۔ مومنانہ طرز فکر یہی ہے کہ بندے سے خواہ کیسے بھی گناہ ہو جائیں اس کا کام یہ ہے کہ وہ خدا ہی کے حضور گڑ گڑائے اور اسی کے حضور اپنی ندامت کے آنسو پکائے۔ بندے کیلئے خدا کے سوا کوئی اور دروازہ نہیں جہاں اسے معافی مل سکے۔ حد یہ ہے کہ اگر آدمی خدا کو چھوڑ کر رسول ﷺ کو خوش کرنے کی کوشش بھی کرے گا تو خدا کے دربار میں

ربیع اور حضرت بلال بن امیہؓ مراد ہیں اور ان تینوں کی مثالی توبہ ربیعی زندگی تک کیلئے مومنوں کیلئے مشعل راہ ہے۔ حضرت کعب بن مالکؓ جو بڑھاپے میں نابینا ہو گئے تھے اور اپنے صاحبزادے کے سہارے چلا کرتے تھے۔ انہوں نے خود اپنی مثالی توبہ کا نصیحت آموز واقعہ اپنے بیٹے سے بیان کیا تھا جو حدیث کی کتابوں میں محفوظ ہے۔

غزوہ تبوک کی تیاری کے زمانے میں جب نبی ﷺ مسلمانوں کو غزوہ میں شریک ہونے پر ابھارا کرتے تھے۔ میں بھی ان صحبتوں میں شریک رہتا۔ میں جب بھی آپ ﷺ کی باتیں سنتا دل میں سوچتا کہ میں ضرور جاؤں گا لیکن واپس جب گھر آتا تو سستی کر جاتا اور سوچتا ابھی بہت وقت ہے، میرے پاس سفر کا سامان موجود ہے، میں صحت مند ہوں، سواری اچھی سے اچھی مہیا ہے پھر روانہ ہوتے کیا دیر لگے گی اور بات ٹلتی رہی یہاں کہ سارے مجاہدین میدان جنگ میں پہنچ گئے اور میں مدینہ میں بیٹھا ارادہ ہی کرتا رہا۔

اب خبریں آنے لگیں کہ نبی ﷺ واپس آنے والے ہیں اور ایک دن معلوم ہوا کہ آپ ﷺ واپس آگئے اور حسب معمول مسجد میں ٹھہرے ہوئے ہیں۔ میں بھی مسجد میں پہنچا۔ یہاں منافقین حضور ﷺ کی خدمت میں پہنچ رہے تھے اور لمبی چوڑی قسمیں کھا کھا کر اپنے عذرات پیش کر رہے تھے۔ نبی اکرم ﷺ ان کی بناوٹی باتیں سن کر ان کے ظاہری عذر قبول کر رہے تھے اور فرماتے جاتے خدا تمہیں معاف کرے۔

جب میری باری آئی تو نبی ﷺ نے مجھ سے کہا۔ کہو تمہیں کس چیز نے روک دیا تھا؟ میں نے دیکھا کہ آپ ﷺ کی مسکراہٹ میں غصہ کے آثار ہیں اور میں نے صاف صاف بات کہہ ڈالی۔ اے خدا کے رسول ﷺ واقعہ یہ ہے کہ مجھے کوئی عذر نہ تھا۔ میں صحت مند تھا۔ خوشحال تھا۔ سواری بھی میرے پاس موجود تھی۔ بس میری سستی اور غفلت نے مجھے اس سعادت سے محروم رکھا۔

(جاری ہے)



فاتح تختہ دار

وہ لمحات جب ظلم و جبر اور اندھیروں کے نقیب سورج کو گرفتار کرنے آئے۔ سید ابوالاعلیٰ کی گرفتاری اور فوجی عدالت سے سزائے موت سنائے جانے کی یہ روداد پاکستان کے نظریاتی تشخص کی تشکیل اور بقا کی جدوجہد کا ایک اہم باب ہے۔

کی آواز سے ان کی آنکھ کھل چکی تھی۔ یہ محمد یحییٰ اور شیخ فقیر حسین صاحبان تھے۔ انہوں نے اٹھ کر برآمدے کا بلب روشن کیا تو باہر ایک ایسا منظر دیکھا جس پر انہیں یقین نہیں آرہا تھا۔

انہوں نے دیکھا کہ تین جانب سے فوجی ٹرک مرکز جماعت اسلامی کو گھیرے ہوئے ہیں۔ ان کے ساتھ فوجی گاڑیاں بھی ہیں۔ کچھ فوجیوں نے سنگینیں تانی ہوئی ہیں اور وہ کوٹھی کے ارد گرد ایک ہی اشارے پر بزن کرنے کے لئے تیار کھڑے ہیں۔ اتنے میں خفیہ محکمے اور فوج کے کچھ افسر ہاتھوں میں چند کاغذات لئے کوٹھی کے اندر پہنچ گئے ایسے وقت میں اور اس انداز میں خفیہ پولیس اور فوج کے گھیرے سے یوں معلوم ہو رہا تھا، گویا وہ کسی ایسے خطرناک مجرم کو اس کی کمین گاہ سے گرفتار کرنے آئے ہیں، جس سے مسلح مقابلے کا خطرہ ہے۔

لیکن انہیں یہ معلوم نہ تھا کہ وہ جس مرد آزاد کو یہاں گرفتار کرنے کے لئے اتنے لاؤنٹشر کے ساتھ آئے تھے، اس کے لیے یہ باتیں تو محض تکلفات ہیں۔ وہ تو اس مرحلے کے لئے پہلے ہی تیار ہے، اسے پہلے ہی معلوم ہے کہ وہ راہ حق کی جس کٹھن منزل کی جانب سرگرم سفر ہے اس میں مخالفت، فتوے، زنجیریں، ہتھکڑیاں، قید و بند اور ظلم و جور تو ہوتا ہی ہے، کبھی کبھی ایسے مسافر کو فرازدار کے مرحلے سے بھی گزرنا پڑتا ہے۔

ان افسروں نے یحییٰ صاحب سے پوچھا: ”کیا مولانا مودودی موجود ہیں۔“

ابھی انہوں نے اثبات میں جواب دیا ہی تھا کہ اندر کی طرف سے دروازے کی چٹختی کھلنے کی آواز سنائی دی۔ افسر اس لمحے کے لیے تیار اور رد عمل کو جاننے کیلئے بے چین تھے۔ کیا ملزم مزاحمت کرے گا؟ کیا تھوڑی دیر بعد خون خوابہ ہوگا؟ کیا انہیں گرفتاری عمل میں لانے کے لیے فوجی

مشرق سے ستارہ سحر نمودار ہو رہا ہے!

ہر سو ایک گہرا سکوت طاری ہے۔ لوگ اپنے اپنے بستر اسراحت میں محو خواب ہیں۔ وہ ایسی گہری نیند میں ہیں کہ چوکیدار کی بھی کبھار بلند ہونے والی اونچی آواز بھی ان کی نیند میں خلل انداز نہیں ہو سکتی۔ رات کی خنکی کچھ اور بھی بڑھ گئی ہے اور وہ نرم بستروں میں مدہوش پڑے ہیں۔ انہیں کچھ معلوم نہیں کہ ۲۸ مارچ ۱۹۵۳ء کے طلوع خورشید سے پہلے پہلے رات کے اس آخری حصے میں کون سا اہم واقعہ رونما ہونے والا ہے؟ کتنی آنکھیں اشک بار ہوں گی؟ کتنے لوگوں کے خرمن سکون پر بجلی گرنے والی ہے؟ کسے پابند سلاسل کیا جائے گا اور کسے پھانسی کی کوٹھڑی میں ڈالا جائے گا؟

یہ ۲۸ مارچ ۱۹۵۳ء

لاہور کی فیروز پور روڈ پر اچھرہ موڑ کے پاس ایک جیب مشرقی سمت کی گلی میں مڑی تو اس نے اپنے سامنے روشنی میں دیکھا کہ ذیلدار پارک کی کشادہ گلی سنسان پڑی ہے۔ اس کے پیچھے پیچھے دوسری جیب، گاڑیاں اور ٹرک ہو لئے۔ تھوڑی دور آگے جا کر ایک کوٹھی کے سامنے پہلی جیب رک گئی تو باقی قافلہ بھی قہم گیا۔ جیب میں سے پاکستانی فوج کا ایک چاق چوند افسر باہر نکلا۔ اس نے بازو کو ہوا میں گھماتے ہوئے اشارہ کیا کہ سب ٹرک اور گاڑیاں کوٹھی کے ارد گرد جھیل جائیں۔ جلد ہی پوری خاموشی کے ساتھ اس کے حکم کی تعمیل ہونے لگی اور فوجی جوان سنگینیں تانے پہلے سے طے شدہ منصوبے کے مطابق کوٹھی ۵ اے ذیلدار پارک کے تینوں جانب مستعد کھڑے ہو گئے۔

اس افسر نے دیکھا کہ کوٹھی کا سبزہ زار تاریکی میں ڈوبا ہوا ہے اور ہر طرف خاموشی کا راج ہے۔ کوٹھی کی دائیں جانب کے بغلی کمرے میں دو صاحبان لحاف اوڑھے محو خواب تھے۔ لیکن اب فوجی ٹرکوں اور جیپوں

اس آپریشن کی قیادت کرنے والے فوجی افسر نے اخلاقاً سلام میں پہل کی اور دوسرے افسر نے معذرت چاہتے ہوئے سید صاحب کو بتایا کہ: ”آپ کو سیفٹی ایکٹ کے تحت گرفتار کیا جا رہا ہے اور اب آپ زیر حراست ہیں۔“

سید صاحب نے یس کر مختصر اُصرف اتنا ہی کہا: ”اچھا“.....
اس اطمینانِ قلب کے ساتھ جس کی ان افسروں کو توقع نہیں ہو سکتی تھی، سید صاحب نے کہا: ”اگر تھوڑا سا وقت دیں تو تیار ہوں۔“
افسر اعلیٰ نے ایک لمحہ توقف کیا، سوچا اور پھر اثبات میں سر ہلا دیا۔ اسی لمحے ساتھ کھڑے پولیس افسر نے سید صاحب کو وارنٹ دکھائے کہ وہ ان کے گھر کی اور جماعت اسلامی کے مرکزی دفتر کی تلاشی لینا چاہتے ہیں۔
سید صاحب نے شیخ فقیر حسین صاحب کی طرف اشارہ کیا کہ وہ اس ”کارِ خیر“ میں ان کی مدد کریں گے اور خود اندر چلے گئے۔

پولیس اور خفیہ محکمے والے گھر اور دفتر کی تلاشی میں مصروف ہو گئے۔ زنانہ پولیس گھر کے اندر چلی گئی۔ بیگم مودودی نے پولیس کی ان خواتین سے کہا: ”آپ اس گھر میں جہاں اور جو کچھ دکھنا چاہتی ہیں اطمینان سے دیکھیں۔“ باہر دفتر میں پولیس نے جماعت اسلامی کے دفاتر میں پڑی فائلیں، حسابات کی رسیدیں اور مرکزی شوریٰ کے اجلاسوں کی کارروائی کا رجسٹر اور دوسرے بہت سے کاغذات اکٹھے کر کے ایک ڈھیر لگا لیا۔ بیت المال کے دس ہزار تین سو روپے قبضے میں لے لیے۔ (اس رقم کے متعلق پھر کبھی معلوم نہ ہو سکا کہ یہ کس کی جیب میں گئی، کیونکہ بعد میں تحقیق سے معلوم ہوا کہ سرکاری کاغذات میں کہیں اس کا اندراج نہیں کیا گیا تھا)۔

فوجی افسر اطمینان سے کرسیوں پر بیٹھے رسالہ ”قادیانی مسئلہ“ پڑھتے رہے۔ جس کی بہت سی کاپیاں انہیں دفتر میں مل گئی تھیں۔ سید مودودی کی گرفتاری کے اس فوجی آپریشن میں شریک قریباً سبھی افراد نے اس کو پڑھا۔ یہی کتابچہ سید مودودی کی اس گرفتاری کا سبب تھا۔

پولیس نے تلاشی کا کام جاری رکھا، حتیٰ کہ صبح کے پونے چار بجے کا وقت ہو گیا۔ اس وقت سید مودودی بھی تیار ہو کر باہر تشریف لے

قوت کو حرکت میں لانا پڑے گا؟ بچی صاحب اور فقیر حسین صاحب خاموش کھڑے یہ سب کچھ دیکھ رہے تھے۔ کوٹھی کے ارد گرد کھڑی ہوئی جیپوں میں موجود اور گھیرا ڈالے ہوئے مستعد فوجی جوانوں کی نگاہیں دروازے پر جمی ہوئی تھیں کہ دیکھیں یہاں سے کون نمودار ہوتا ہے۔ انہوں نے غیر متوقع صورتحال سے نبرد آزما ہونے کے لئے اپنی انگلیاں رائفلوں کی لمبی پر رکھ لیں۔ ادھر دروازہ کھلا اور ایک صاحب نمودار ہوئے، جن کے چہرے سے سکون و اطمینان کی گہری کیفیت جھلک رہی تھی۔

یہ صاحب، سید ابوالاعلیٰ مودودی تھے!

جنہیں عرف عام میں سید مودودی یا مولانا مودودی کہا جاتا ہے۔ سید صاحب اسلام کے مذہبی، اخلاقی، معاشی، معاشرتی اور سیاسی پہلوؤں پر سو سے زیادہ کتابوں کے مصنف ہیں۔ وہ قرآن، حدیث و فقہ کے ساتھ ساتھ عمرانی مسائل، فلسفہ، معاشیات اور علم سیاسیات کے معتبر عالم ہیں۔ انہوں نے اپنی دل آویز شخصیت، دل نشیں طرزِ انشا اور دل کش اسلوبِ تحریر سے مسلمانوں کو ان کا بھولا ہوا سبق یاد دلایا ہے۔ لاکھوں مسلمانوں کو اپنی حرارتِ ایمانی سے گرمادیا ہے اور ان کے دلوں میں حقیقی اسلامی نصب العین، عملاً حکومتِ الہیہ کے قیام اور تعمیر، اصلاً رضائے الہی اور نجاتِ اخروی کے حصول کی تڑپ پیدا کر دی ہے۔

یہی سید مودودی ہیں جن کے افکار کا اثر زندگی اور ادب کے ہر شعبے میں صاف محسوس ہوتا ہے۔ ان کے پرزور دلائل کے سامنے تہذیبِ حاضر کے افکار کی سر بہ فلک عمارت زمین بوس ہو گئی ہے۔ ان کے افکار نے مسلم جوانوں کے سینوں میں عزائم کو بیدار کر دیا ہے اور برصغیر پاک و ہند اور عالم اسلام کے کروڑوں ذہنوں کو نہ صرف جلا بخشی ہے بلکہ عمل اور انقلاب کے لئے کھڑا کر دیا ہے۔ انہوں نے جدید انداز کی ایک منظم اور مربوط مذہبی اور سیاسی جماعت بنا کر اسے ایسا اعلیٰ نظم و ضبط اور عمدہ تربیت دی ہے کہ اس سے ایک عام مسلمان کو اسلام کی نشاۃ ثانیہ کی امید بندھتی ہے اور مخالفین اسے بخ و بن سے اکھاڑ پھینکنے کے لئے ہمیشہ ہی تلملالتے دیکھے گئے ہیں۔

یہی وہ سید مودودی ہیں جو موجودہ زمانے میں مسلمانوں کی سب سے بڑی آرزو یعنی تعمیرِ ریاستِ اسلامی اور اتحادِ عالمِ اسلامی کی علامت ہیں۔

آئے۔ انہوں نے اونچی باڑھ والی مخصوص قراقی ٹوپی پہنی ہوئی ہے۔ صحت مند جسم اور میانہ قد پر نسواری رنگ کی گرم شروانی ان کی شخصیت کو نکھار رہی ہے۔ سلیقے سے ترشی ہوئی سفید براق داڑھی ان کے چہرے کو اور بھی نورانی بنا رہی ہے۔ روشن خدو خال، کھلتی ہوئی صبیح رنگت اور کشادہ گول چہرے پر کھلی پیشانی ان کی ذہانت و شرافت، وسعتِ ظرف اور حسنِ خلق کی غمازی کر رہی ہے۔ سید صاحب وضع دار لوگوں میں سے ہیں۔ وہ تنگ موہری کا سفید پاجامہ ہی پہنتے ہیں۔ لیکن تقریباً تین چار ماہ سے ان کی دونوں پنڈلیوں کی گھٹنوں تک داد کی تکلیف ہے جس کی وجہ سے انہوں نے اپنی عادت کے خلاف ڈھیلا پاجامہ پہن رکھا ہے۔ ٹوپی کے نیچے سیاہ بالوں کی نمی یہ بتا رہی ہے کہ وہ ابھی غسل کر کے آئے ہیں۔ ایسے لگتا ہے، جیسے وہ جیل نہیں جا رہے ہیں، بلکہ زبان حال سے ’مرضی مولیٰ از ہمہ اولیٰ‘ کہتے ہوئے عام سفر کے لئے ہشاش بشاش نکلے ہیں۔ آتے ہی انہوں نے کہا: ”میں تیار ہوں۔“

ان کا مطمئن اور شگفتہ چہرہ مردِ مومن کے اوصاف کی عملی تفسیر تھا۔ خفیہ پولیس والوں نے تلاشی کے ’مالِ غنیمت‘ کو ساتھ لیا۔ سید صاحب بھی فوجی جیب میں سوار ہوئے اور اس کے ساتھ ٹوکوں کا کاررواں روانہ ہوا تو سید صاحب کے بچے اور ساتھی انہیں ایک نئی منزل کی طرف جاتے ہوئے دیکھ رہے تھے۔

آسمان پر ابھی تک بہت سے ستارے جھلما رہے تھے۔ ان کے ہلتے ہوئے ہونٹ بتا رہے تھے کہ وہ ایک دوسرے سے سرگوشیاں کر رہے ہیں۔

ایک ستارے نے دوسرے سے کہا: ”علمائے حق کی پہچان یہی ہے کہ ابتلا و آزمائش کی کٹھن راہوں میں ان کے پاؤں میں لغزش نہیں آتی۔ سید کے صیادوں کا یہ خیال کتنا مضحکہ خیز ہے کہ وہ اس عظیم المرتبت انسان کو داد و رسن سے ڈرا کر نصب العین سے منحرف کر سکیں گے۔“

دوسرے ستارے نے کہا: ”حق و باطل کی آویزش میں یہ مقام آکر ہی رہتا ہے۔ ذرا دیکھو! یہ مردِ حق آگاہ کتنی بلند حوصلگی سے سوئے دار بڑھ رہا ہے۔“

تیسرے ستارے نے کہا: ”دار و رسن تو عظمت کی سیڑھیاں ہیں۔ اس مردِ خود آگاہ و خدا آگاہ کے صیاد نہیں جانتے کہ وہ سید صاحب کو عظمتوں

کے ہمالہ کی چوٹی پر لے جا رہے ہیں۔“

سید مودودی کو کس جرم کی پاداش میں گرفتار کیا گیا تھا، اس سے اس وقت کا ارباب اقتدار کا پورا طائفہ واقف تھا۔ انہوں نے سب سے بڑا یہ ’جرم‘ کیا تھا کہ وہ قیام پاکستان کے فوراً بعد یہ مطالبہ لے کر اٹھے تھے کہ: ”ملک کا دستور اسلامی بنایا جائے۔“ پھر اس تحریک کے ذریعے سے انہوں نے پاکستان کے ہر فرد کو یہ شعور دے دیا کہ ملک و قوم کے لئے دستور ایسے سرچشمے کی حیثیت رکھتا ہے جس کے مطابق قوانین، نظامِ تعلیم، معاشرت، معیشت اور سیاست کی ڈگر متعین ہوتی ہے۔ پھر انہوں نے دلائل کے ساتھ اہل علم حضرات کو اس بات پر مطمئن کر دیا تھا کہ ایک جدید فلاحی ریاست کے لئے قرآن اور حدیث سے رہنما اصول حاصل کئے جاسکتے ہیں۔ پھر انہوں نے جماعت اسلامی کی تنظیم کے ذریعے سے اس مطالبے کو ملک گیر بنا کر ارباب اقتدار کو مجبور کر دیا کہ وہ قراردادِ مقاصد منظور کریں۔

اس سے بھی بڑھ کر سید مودودی کا ’جرم‘ ارباب اقتدار کی نظر میں یہ تھا کہ انہوں نے ہر مکتب فکر کے جید علما کو جن میں شیعہ، دیوبندی، بریلوی اور اہل حدیث بھی شامل تھے، اسلامی دستور کے لئے علمائے مشہور بانئیں نکات مرتب کرنے میں علمی و عملی مدد دی تھی اور اب علما و عوام ملک کے گوشے گوشے سے اسلامی دستور کا مطالبہ کر رہے تھے۔ وہ اسلامی دستور جس میں ارباب اقتدار کے مختصر، مغرب زدہ اور راگ رنگ کے دل دادہ طبقے کو اپنی موت موت آتی تھی، جو انگریز کے چلے جانے کے بعد پاکستان میں برسرِ اقتدار آ گیا تھا، اور اب اس قومی امانت کو آمریت میں بدل رہا تھا۔

ان لوگوں کے ایک سیکولر اور آمرانہ دستور بنانے کے راستے میں یہی سید مودودی سب سے بڑی رکاوٹ تھے۔ چنانچہ انہوں نے ارادہ کر لیا کہ تحریکِ ختمِ نبوت کی آڑ میں سید صاحب کو اپنے راستے سے ہمیشہ کے لئے ہٹا دیا جائے۔

روپیہ کہاں سے آتا ہے؟

تاریخ کے اوراق پر یہ بات محفوظ ہے کہ جب حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے اپنے زمانے کے اہل اقتدار کو ان کی عیاشیوں پر برسرِ عام ٹوکا تھا تو انہیں قتل کے ایک جھوٹے مقدمے میں ملوث کر کے صلیب پر

لٹکانے کے لئے گرفتار کر لیا گیا تھا۔ اسی طرح اس وقت کی حکومت کسی طرح یہ بہتان سید مودودی کے سر تھوپنا چاہتی تھی کہ انہیں کسی بیرون ملک سے روپیہ ملتا ہے تاکہ عالم اسلام کے عوام کی نظروں میں اس قابل احترام ہستی کو کردار کشی کی صلیب پر لٹکا دیا جائے۔

چنانچہ شاہی قلعہ لاہور میں جہاں مارشل لا (۱۹۵۳) کے اکثر اسیروں کو رکھا گیا، وہاں سید مودودی کے ایک ساتھی چراغ دین صاحب سے سید مودودی کے ذاتی حسابات معلوم کئے گئے۔ اُن کی آمدنی اور اخراجات کے بارے میں کرید کی گئی۔ غیر ملکی لوگوں سے ملاقات اور بنکوں کے بارے میں پوچھ گچھ کی گئی۔ لیکن کوئی بات گرفت کے قابل نہ مل سکی۔

یہ گھناؤنا الزام اس کے بعد کی حکومتیں بھی لگاتی رہیں اور حکومتیں ہی نہیں، نام نہاد علما بھی یہ مکروہ الزام لگاتے رہے ہیں۔ جب یہ لوگ جماعت اسلامی کے عظیم الشان اجتماعات دیکھتے ہیں، اتنا وسیع لٹریچر لوگوں کے ہاتھوں میں پہنچتے ہوئے پاتے ہیں، جلسے جلوس، نئی نئی ہمیں، تربیت گاہیں، دفاتر اور ان کے عملے، استقبالیے، عوامی خطابات اور رفاہی کام دیکھتے ہیں تو حیران رہ جاتے ہیں کہ ان سب باتوں کو کیلئے تو بلا مبالغہ لاکھوں روپے کی ضرورت ہوتی ہے اور سرمایہ دار لوگ جماعت اسلامی کے قریب بھی نہیں پھٹکتے، پھر یہ جماعت اسلامی سے تعلق رکھنے والے غریب اور متوسط طبقے کے لوگ اتنا پیسہ کہاں سے لے آتے ہیں؟

لیکن جو لوگ جماعت کی تنظیم کو بخوبی جانتے ہیں، انہیں معلوم ہے کہ جماعت کے (۱۹۹۳ میں) تقریباً ساڑھے آٹھ ہزار ارکان اور کئی لاکھ کے لگ بھگ متفقین اور متاثرین جماعت اسلامی کو باقاعدہ مالی اعانت دیتے ہیں۔ ارکان نہ صرف اپنی پوری زکوٰۃ اور عشر کی رقم بلکہ صدقات بھی جماعت کو دیتے ہیں اور وقتاً فوقتاً ہنگامی مدد بھی کرتے رہتے ہیں۔ دوسری بات جسے جماعت کے مخالفین موجودہ معاشرتی گراؤ میں سمجھنے سے عام طور پر قاصر رہتے ہیں، وہ جماعت سے وابستہ لوگوں کی دیانت و راست بازی ہے۔ جماعت کے لوگ پیشتر کام اپنے ہاتھوں سے کرتے ہیں بلکہ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ اپنے حصے کے کام کے اخراجات بھی ہر شخص خود کرتا ہے۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ تھوڑے سرمائے سے وہ کام انجام پاتا ہے، جسے دوسرے صرف کثیر سے بھی انجام نہیں دے سکتے۔

مثلاً اکتوبر ۱۹۵۰ میں ملتان میں منعقد ہونے والے عظیم الشان جلسے کے بارے میں سرکاری پارٹی کے ایک رہنما کا خیال تھا کہ اس پر ۸۰ ہزار سے لے کر ایک لاکھ روپے تک خرچ آیا ہوگا، لیکن حقیقت یہ تھی کہ جماعت اسلامی نے اس پر پانچ ہزار روپے سے بھی کم رقم خرچ کی تھی۔

پھر ایک تحریک اور ایک مقصد کے ساتھ ذہنی اور جذباتی لاگو بہت بڑی چیز ہے، یہ انسان کو قربانی پر آمادہ کر کے ایثار پیشہ بنا دیتی ہے اور اس بات کو تو مخالفین بھی مانتے ہیں کہ جماعت سے تعلق رکھنے والے لوگوں کو سید مودودی اور جماعت اسلامی اور اس سے بڑھ کر خدا اور رسول ﷺ کے ساتھ جو فدا یانہ وابستگی اور شیفنگی ہے، وہ اس برصغیر میں کم ہی کسی تحریک کے کارکنوں میں پائی جاتی ہے۔

فوجی عدالت میں مقدمہ

ملک میں سیکولر دستور لانے کی کوشش کرنے والے گروہ کے سرخیل ملک غلام محمد تھے۔ جو ملک کی بدقسمتی سے اس وقت گورنر جنرل بھی تھے۔ جب انہیں معلوم ہوا کہ سید مودودی کے خلاف غیر ملکی امداد کے بہانے کے لئے ایک شوشہ تک بھی نہیں ملا تو وہ ایک خصوصی طیارے کے ذریعے سے کراچی ۳ مئی ۱۹۵۳ء کو لاہور پہنچے۔ اس روز دو پہر کی خبروں میں اعلان ہوا کہ سید مودودی پریسٹی ایکٹ کے بجائے مارشل لا کے تحت فوجی عدالت میں مقدمہ چلایا جائے گا۔ دوسری صبح ملک غلام محمد کراچی لوٹ گئے جو ان دنوں پاکستان کا دارالحکومت تھا اور جب سید صاحب کے مقدمے کی باقاعدہ کارروائی شروع ہوئی تو غلام محمد اس پورے عرصے میں گورنر ہاؤس لاہور میں رونق افروز رہے، تاکہ فوجی عدالت میں بجوں کی کرسیوں پر بیٹھی ہوئی کھڑے چلیوں کے تاروں کو اپنی مرضی کے مطابق ہلا سکیں۔

فوجی عدالت کو بھی آخر کوئی الزام تو چاہیے تھا جس کی بنا پر وہ سید صاحب پر مقدمہ چلاتی۔ تلاش بسیار کے بعد انہیں ایک بودی سی بات ہاتھ لگی کہ سید صاحب نے فروری اور مارچ ۱۹۵۳ء میں اخبارات کو دو بیان دیئے تھے اور ”قادیانی مسئلہ“ نامی کتابچہ لکھا تھا۔ یہ دونوں کام بھی لاہور میں مارشل لا (۱۹۵۳) لگنے سے پہلے ہوئے تھے۔ اصحاب اقتدار نے ایسا مضحکہ خیز اقدام کرنے سے بھی گریز نہ کیا، جو ان کی نیوٹوں کے فتور کو آشکارا کر دینے والا تھا۔ بڑی دیدہ دلیری سے انہوں نے ایک نیا

مارشل لاریگولیشن (نمبر ۲۳) بنا ڈالا، جس کی رو سے فوجی عدالتوں کو یہ اختیار بھی دے دیا گیا کہ وہ مارشل لا لگنے سے پہلے کے جرائم کی سماعت بھی کر سکتی ہیں۔

گویا مودودی صاحب! ہم آپ کو چھوڑیں گے نہیں۔ آپ کو اسی بات پر پکڑ لیتے ہیں کہ آپ نے لیڈر ہو کر بیان کیوں دیئے اور مصنف ہوتے ہوئے کتاب کیوں لکھی؟ اور اس بات کا ٹینگڑ بنا کر اپنی مرضی کی سزا بھی دیں گے۔

کیا یہ وہی بھیڑیے اور میٹھے والی کہانی نہیں ہے؟ ’تم میرا پانی گدلا کر رہے ہو‘ نہیں جناب! ندی کا پانی آپ کی طرف سے میری جانب آ رہا ہے۔ ’تم نے مجھے پچھلے سال گالیاں کیوں دی تھیں؟‘ جناب میں تو پچھلے سال پیدا ہی نہیں ہوا تھا۔ ’تو پھر وہ تمہارا باپ ہو گا۔ چنانچہ میں تمہیں ضرور ہڑپ کروں گا!‘

سید مودودی کو شاہی قلعہ لاہور سے سنٹرل جیل میں منتقل کر دیا گیا اور انہیں نئی فرد جرم دے دی گئی کہ آپ نے بیانات کیوں دیئے اور ’قادیانی مسئلہ‘ پمفلٹ کیوں لکھا۔ سید صاحب نے اسی روز اپنے دست راست میاں طفیل محمد کو ان الزامات کا تقریباً بیس صفحات پر مشتمل جواب لکھوا دیا۔ مولانا امین احسن اصلاحی نے اسے پڑھا تو ان کا کہنا ہے:

مجھے محسوس ہوا کہ مولانا مودودی کے صبر و ضبط اور سکون و اطمینان کا جب میں نے کوئی اندازہ لگایا تو ہمیشہ اس سے کچھ زائد نکلے۔ اس بیان میں بھی نہ غصہ، نہ جھنجھلاہٹ تھی اور نہ سختی، نہ درشتی بلکہ اس کے بجائے وہی باوقار انداز، سنجیدہ طرز بیان، ٹھوس دلائل اور ٹھنڈا طریق استدلال۔ بس یہی معلوم ہوتا تھا کہ جیل کی چار دیواری میں نہیں، بلکہ اپنی لائبریری کی پرسکون فضا میں بیٹھ کر یہ بیان لکھا ہے۔ شاید یہ اسی تاثیر کا نتیجہ تھا کہ جب میں باہر جانے سے قبل مولانا سے رخصت ہونے اور ان کا تحریری بیان واپس کرنے کے لئے ان کے پاس گیا تو معاملے کے ساتھ میں نے بے ساختہ ان کے ہاتھوں کو چوم لیا، جن میں اللہ تعالیٰ نے قلم کی مدد سے اظہارِ حق کی کیسی قدرت و دلچسپی فرمائی تھی۔ (ماہنامہ چراغِ راہ، اکتوبر ۱۹۵۳ء، ص ۱۰)

۸ مئی ۱۹۵۳ء کو سید مودودی کا مقدمہ سنٹرل جیل لاہور کی ایک خاص عمارت میں شروع ہوا۔ یہ سرخ اینٹوں کا ہال تھا، جسے قیام پاکستان سے پہلے، انگریزی حکومت کے خلاف ایک مقدمہ بغاوت کی سماعت کے لیے خاص طور پر تیار کیا گیا تھا۔ پاکستان کا مطلب کیا ’لا الہ الا اللہ‘ کا نعرہ لگا کر ملک حاصل کرنے والے ارباب اقتدار کی نظروں میں اسلامی دستور کا مطالبہ کرنے والے سید مودودی بھی ’بغاوت‘ کے جرم کے مرتکب تھے۔

اگر کوئی دل فطرت شناس رکھتا ہو تو اس کے لیے اس حقیقت میں کیسا سبق ہے کہ جس گورنر جنرل ملک غلام محمد کے ایما پر سزائے موت سنائی گئی، وہ عبرت کی موت مرا اور اس کی تلاش کو غیر مسلموں کے قبرستان میں جگہ ملی اور جس ہال میں نام نہاد مقدمہ بغاوت کی کارروائی انجام پائی قدرت نے اسے صفحہ ہستی سے ہی مٹا دیا..... سنٹرل جیل لاہور کے اس حصے کی جگہ اب لاہور کی ایک نواجمی ہستی شادمان کالونی بن چکی ہے۔

حق گوئی و بے باکی

لوگوں کو معلوم ہوا کہ سید صاحب کے مقدمے کی کارروائی فوجی عدالت میں ۸ مئی سے شروع ہو رہی ہے تو وہ جوق در جوق مذکورہ ہال کے باہر صبح ہی صبح جمع ہو گئے عقیدت مندوں کا ایک ہجوم ہے، جس میں بے شمار لوگ لاہور سے باہر کے ہیں۔ وہ سید صاحب کو ایک نظر دیکھنے اور ان کا تاریخی مقدمہ سننے کے لئے آئے ہیں۔ سید مودودی اور ان کے رفقاء کو پہرے میں لایا جا رہا ہے اور وہ پورے ثبات اور عزم کے ساتھ قدم بڑھاتے ہوئے آ رہے ہیں۔

لوگ ہال میں داخل ہوتے ہیں تو دیکھتے ہیں کہ ہال کی عمارت پرانی سی ہے جہاں اس گرم موسم کے لئے ہوا کا مناسب انتظام نہیں۔ تین فوجی افسر اپنی خاکی رنگ کی کلف دار وردیوں میں ملبوس ججوں کی کرسیوں پر مٹی کے مادھو بنے بیٹھے ہیں اور ان کے چہرے جذبات سے عاری ہیں۔ ان کے پاس ہی ایک محرر بیٹھا ہے۔ جو صفائی کے گواہوں اور استغاثے کے بیانات قلمبند کر رہا ہے۔ سید مودودی کٹہرے کے پاس دائیں جانب رکھی ہوئی ایک میز کے سامنے بیٹھے ہیں۔ ان کے پیچھے کٹہرے کے اندر ملک نصر اللہ خاں عزیز، سید تقی علی اور دونوں مالکان

پریس ایک اونچی بیخ پر دو مسلح سپاہیوں کے درمیان بحیثیت ملزم بیٹھے ہیں۔

عدالت میں سید مودودی کے ۲۷ فروری ۱۹۵۳ء والے بیان پر بحث شروع ہوئی۔ روزنامہ تسنیم میں شائع ہونے والے اس بیان میں سید صاحب نے حکومت کے بارے میں کہا تھا کہ: ”وہ تھانیدار کے دماغ سے سوچتی ہے۔“ تو ان کے وکیل نذیر احمد (بعد ازاں اٹارنی جنرل) نے مشورہ دیا تھا: ”سید صاحب صرف اتنی بات کہہ دیں کہ روزنامہ تسنیم میں شائع ہونے والے بیان کا حرف بحرف درست ہونا یا ان کی تحریر کے مطابق ہونا ضروری نہیں ہے، پھر میں خود بحث کر لوں گا۔“ لیکن سید صاحب نے اس مشورے کو قبول کرنے سے قطعی انکار کر دیا۔ جب اخبار پیش کر کے عدالت نے اس بیان کے بارے میں پوچھا تو سید صاحب اپنی جگہ سے اٹھے، عدالت کے سامنے آئے، انہوں نے تسلیم کیا کہ یہ ان کا بیان ہے، اور کہا:

”میں اس کے ایک ایک لفظ کی ذمہ داری قبول کرتا ہوں۔“

(ماہنامہ چراغ راہ اکتوبر ۱۹۵۳ء، ص ۱۱)

حق گوئی و بے باکی ہمیشہ سے آئین جواں مرداں رہا ہے اور یہ ایک ایسی صفت ہے کہ بڑے سے بڑے کٹر مخالف بھی اس خوبی کا اعتراف کئے بغیر نہیں رہ سکتے۔ اسی لئے سید صاحب کے ایک ناقد پروفیسر محمد سرور نے لکھا ہے:

مولانا ابوالاعلیٰ مودودی صاحب کی جرأت گفتار اور جرأت کردار کا تو کیا کہنا۔ اس معاملے میں تو شاید ہی کوئی دینی و سیاسی شخصیت ان کے مقابلے میں لائی جاسکے۔ (چہرے، ص ۲۵، پیش لفظ از پروفیسر محمد سرور)

امام مودودیؒ

ہر روز ایسے ہوتا کہ لوگوں کی بھیڑ جیل کے پھانک پر سید مودودی اور ان کے رفقا کے نکلنے کی منتظر رہتی، پھر ان کو اپنے جلو میں لئے کمرہ عدالت تک آتی۔ کارروائی کے درمیانی وقفوں میں بھی ایک بڑا ہجوم سید صاحب کے گرد جمع رہتا، یہاں تک کہ عدالتی کارروائی ختم ہونے پر لوگ پھر سید صاحب اور ان کے مسلح محافظوں کو اپنے درمیان لے کر حفاظت

سے جیل کے پھانک تک پہنچا دیتے۔ چار روز تک مقدمے کی یہ نمائش کارروائی ہوتی رہی، آخری روز اٹارنی کو سماعت ختم ہوئی اور مارشل لا کے تحت فوجی عدالت فیصلہ سنائے بغیر برخواست ہو گئی۔

سید صاحب سے واپسی پر کسی نے پوچھا: ”آپ کا کیا خیال ہے یہ آپ کو کیا سزا دیں گے؟“ (ماہنامہ چراغ راہ اکتوبر ۱۹۵۳ء)

سید صاحب نے بلا تامل کہا: ”یہ لوگ تو وہی سزا دیں گے جس کا انہیں اوپر سے اشارہ ہوگا۔“

اور سید صاحب کی اس بات کی تصدیق کچھ عرصہ بعد اس فوجی عدالت کے ایک معزز رکن نے خود کی۔ وہ فوج سے الگ ہوئے تو ایک روز سید صاحب کو ملنے ان کے پاس آئے اور قسم کھا کر کہا: ”آپ کی موت کا حکم ہم نے خود نہیں لکھا تھا، اوپر سے ہم پر القا کیا گیا اور ہمیں اپنی نوکریوں کی وجہ سے اسے مجبوراً نافذ کرنا پڑا۔“ (دفتر روزہ ایشیا، ۱۱ مارچ ۱۹۷۳ء)

سید صاحب نے اس جھوٹے مقدمے سے بہت پہلے ستمبر ۱۹۴۰ء میں نام نہاد مسلم قوم پرست حکومت کے بارے میں اظہار خیال کرتے ہوئے ایک ایسی بات کہی تھی جسے مسلم لیگ کی حکومت نے اپنے عمل سے پیش گوئی میں تبدیل کر دیا۔ سید صاحب نے مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے اسٹریجی ہال میں ”اسلامی حکومت کس طرح قائم ہوتی ہے“ کے موضوع پر تقریر کرتے ہوئے فرمایا تھا (ص ۲۲):

”وہ قومی حکومت جس پر اسلام کا نمائش لیبل لگا ہوا ہوگا، اسلامی انقلاب کا راستہ روکنے میں اس سے بھی زیادہ جبری اور بے باک ہوگی، جتنی غیر مسلم حکومت ہوتی ہے۔ غیر مسلم حکومت جن کاموں پر قید کی سزا دیتی ہے وہ مسلم قومی حکومت ان پر سزا، پھانسی اور جلا وطنی کی صورت میں دے گی اور پھر بھی اس حکومت کے لیڈر جیتے جی غازی اور مرنے پر رحمۃ اللہ علیہ ہی رہیں گے۔“

سنٹرل جیل لاہور کا ایک حصہ دیوانی گھر کہلاتا تھا۔ سید مودودی اور جماعت اسلامی کے دیگر رہنما یہیں رکھے گئے تھے۔ ان کے کمروں کے سامنے صحن تھا، جس میں سب لوگ نماز ادا کرتے تھے۔ اٹارنی کو، یعنی

جس روز مقدمے کی سماعت ختم ہوئی، مغرب کی نماز ادا کرنے کے لئے سب لوگ حسب معمول اکٹھے ہوئے۔ سید صاحب امامت کیلئے آگے کھڑے ہوئے۔ مقتدیوں کی صف میں پانچ رفقائے جماعت، ایک باورچی اور ایک نمبردار کھڑے تھے۔

سید صاحب کی تحت اللفظ قرأت میں بھی لُحْن کی ایک خاص پرتائیر کیفیت تھی۔ ایسے لگتا تھا جیسے وہ خدا کے حضور میں عجز و انکسار سے سرخم کئے باتیں کر رہے ہیں۔ جہنم کی خشم ناک یوں کا ذکر کے ہیبت الہی محسوس کر رہے ہیں اور متقیوں کیلئے جنت کی نعمتوں کے ذکر پر ان کا دل آرزوں کا گہوارہ بن گیا ہے۔ استفہامی عبارت کو وہ سوال کے انداز میں پڑھتے تھے اور اوامر و نواہی کے کلامِ ربانی کو احکام کے اسلوب میں ادا کرتے تھے۔ لہجہ کا یہ نشیب و فراز ایک جوئے رواں کے ساز کی طرح تھا، جو دامنِ کوہ کے پیچ و خم سے گزرتی ہوئی خروش پیدا کرتی ہے اور وادی کی وسعتوں میں آکر ایک مدھرنغے میں تبدیل ہو جاتی ہے۔

ایک تو کلام اللہ کی شانِ جلال ہے اور دوسرے الفاظ کی ادائیگی کا اسلوبِ جمال ہے۔ مقتدیوں کے کانوں میں گویا ملکوتی نغمے کا رس گھولاجا رہا ہے۔ سارا عالم گوش بر آواز ہے، جو فردوسِ گوش ہونے کے ساتھ ساتھ دلوں کو بھی نور و ایقان کے کیف سے معمور کر رہی ہے۔ مقتدی یوں محسوس کر رہے ہیں گویا قرآن کے معانی ان کے دلوں پر القا ہو رہے ہیں اور اللہ تعالیٰ ان سے مخاطب ہے:

”کیا لوگوں نے یہ سمجھ رکھا ہے کہ وہ بس اتنی سی بات پر چھوڑ دیئے جائیں گے کہ انہوں نے زبان سے کہہ دیا تھا کہ ہم ایمان لائے اور ان کو آزمایا نہیں جائے گا، حالانکہ ہم نے پہلے گزرنے والے لوگوں کی بھی آزمائش کی تھی۔ اس طرح اللہ راست بازوں اور جھوٹے فریب کاروں کو الگ الگ ظاہر کر دیتا ہے۔ (عنکبوت ۲۳)“

سزائے موت

نمازیوں کو محسوس ہوا کہ نماز کے دوران میں قریب ہی قدموں کی چاپ سنائی دی، لیکن ان میں سے کوئی نماز میں شامل نہیں ہوا۔ غالباً آنے والے واپس ہو گئے۔ امام مودودی نے سلام پھیرا، پھر دعائے

سبزہ زار کے مشرقی حصے میں دو تین فوجی افسر، سپرنٹنڈنٹ جیل اور اس کے عملے کے افراد، نمازیوں کو منتظر نگاہوں سے دیکھ رہے تھے۔ نماز مکمل کرنے کے بعد نمازی اکٹھی ان کے پاس پہنچے۔ رسمی طور سے سلام اور رمصافحے ہوئے، جس کے بعد دونوں طرف خاموشی رہی۔ فضا اور ماحول پر ایک ایسی چپ طاری تھی، جس کا مطلب یہ تھا کہ نمازی اس تجسس میں ہیں کہ یہ لوگ کیا کہنا چاہتے ہیں اور ان لوگوں کو یہ الجھن ہو رہی تھی کہ وہ بات کا آغاز کس طرح کریں۔

ایک افسر کے ہاتھ میں کچھ کاغذات تھے۔ وہ سید مودودی کو پہچانتا نہیں تھا۔ اس نے مہر سکوت توڑی اور پوچھا: ”مولانا ابوالاعلیٰ مودودی صاحب؟“

سید صاحب نے سکون سے کہا: ”فرمائیے،..... میں ہوں۔“ اور اس فوجی افسر نے فوجی عدالت کا وہ فیصلہ سنایا جو تاریخ میں ہمیشہ ہمیشہ کے لئے ثبت ہو کر رہ گیا ہے،.....

”اخبار تنیم میں بیانات شائع کروانے کے جرم میں آپ کو سات سال قید بامشقت اور ملک نصر اللہ خاں عزیز کو تین سال قید بامشقت۔ کتاب قادیان مسئلہ کے پرنٹر اور پبلشر کی حیثیت سے سید تقی علی کو نو سال قید بامشقت، اور قادیانی مسئلہ لکھنے کے جرم میں مولانا ابوالاعلیٰ مودودی کو سزائے موت۔“

میاں طفیل محمد صاحب رقم طراز ہیں کہ سزائے موت کا حکم سن کر میرا رد عمل ایسا تھا جیسا کہ تیز بلیڈ سے جسم کٹ جانے سے ہوتا ہے، کہ آدمی کو تھوڑی دیر تک پتا ہی نہیں چلتا کہ جسم کٹ چکا ہے اور نہ اسے درد ہی محسوس ہوتا ہے۔

ابھی اعصاب کے مالک سید مودودی پر سزائے موت سنائے جانے کا شتمہ بھرا اثر نہ ہوا۔ قتل کے اس پیکر نے اپنی ناکردہ گناہی کی سزا سن کر پورے اطمینان کے ساتھ صرف اتنا کہا:

”بہت اچھا۔“

اسی افسر نے ایک کاغذ، جس پر سزائے موت لکھی تھی، سید مودودی کے ہاتھ میں تھاتے ہوئے کہا:

”مولانا! آپ چاہیں تو سزائے موت کے سلسلے میں ایک ہفتے کے اندر اندر رحم کی اپیل کر سکتے ہیں۔ دوسرے مقدمے کی سزا کی کوئی اپیل نہیں،

ظالم حاکم کی طرف سے رحم کی عنایت خسروانہ کی پیش کش سن کر سید صاحب کا کیا رد عمل ہوا۔ اس کے بارے میں میاں طفیل محمد صاحب نے لکھا ہے:

سید صاحب کا چہرہ بلا مبالغہ انگارے کی مانند تہمتا اٹھا اور آپ نے نہایت باوقار لہجے میں جواب دیا مجھے کسی سے کوئی اپیل نہیں کرنی ہے۔ زندگی اور موت کے فیصلے زمین پر نہیں، آسمان پر ہوتے ہیں۔ اگر وہاں میری موت کا فیصلہ ہو چکا ہے تو دنیا کی کوئی طاقت مجھے موت سے نہیں بچا سکتی، اور اگر وہاں سے میری موت کا فیصلہ نہیں ہوا ہے تو دنیا کی کوئی طاقت میرا بال بھی بیکا نہیں کر سکتی۔ (ماہنامہ چراغ راہ اکتوبر ۱۹۵۳ء ص ۷۱)

سید مودودی نے دو غائیے توقف کیا اور اپنے تلے الفاظ میں اپنا تاریخی فیصلہ سنا دیا۔ اس فیصلے نے انہیں عظمتوں کے تاج پہنا دیئے۔ ایسی عظمتیں کہ جن کے سامنے سلطنت و حکومت و طاقت پر کاہ کے برابر بھی وقعت نہیں رکھتی۔ سید صاحب نے رفقا سے مخاطب ہو کر کہا:

آپ لوگ ایک بات کا خیال رکھیں۔ میں نے کوئی جرم نہیں کیا ہے اور میں ان لوگوں کے سامنے رحم کی اپیل نہیں کروں گا، اور میری طرف سے کوئی شخص بھی اپیل نہ کرے نہ میری والدہ، نہ میرے بھائی، نہ میرے بیوی بچے، کوئی بھی نہیں اور جماعت کے لوگوں سے بھی میری یہی درخواست ہے۔ (ماہنامہ چراغ راہ، اکتوبر ۱۹۵۳ء ص ۷۲)

سوئے دار

رفقائے سید نے اپنے قائد کی یہ جرأت آموز نصیحت سکون و اطمینان سے سنی۔ سید صاحب کے پیچھے سب لوگ خاموشی کے ساتھ بیرک میں داخل ہو گئے۔ سوئے دار جانے کی تیاری شروع ہوئی۔ سید صاحب کا بستر پھانسی کی کوٹھڑی میں جانا تھا۔ میاں طفیل محمد صاحب نے سید صاحب کا بستر کھول دیا۔ ان کے ہاتھوں کی کپکپاہٹ، ان کے دلی

اضطراب کا مظہر تھی۔ سید نقی علی کپڑے اور دوسری چیزیں لا کر بستر پر بجا رہے تھے اور ان کے قدم لرز رہے تھے۔ ملک نصر اللہ خاں عزیز متفکر چہرے کے ساتھ پھر رہے تھے۔ سن رسیدہ چودھری محمد اکبر صاحب بت خانے خاموش کھڑے تھے اور مولانا امین احسن اصلاحی ایک عجب دلی کیفیت کے ساتھ قرآنی دعائیں مانگ رہے تھے۔

بستر بندھ گیا۔ کھانا بھی ایک کپڑے میں باندھ دیا گیا۔ قرآن مجید بھی ساتھ دیا گیا۔ سید مودودی نے چپل کے بجائے اپنا جوتا اور کپڑے کی ٹوپی کے بجائے اپنی قراقلی ٹوپی پہنی، پھر سب سے گلے ملے۔ سوائے ان کے باقی سب کی آنکھیں بھیگی ہوئی تھیں، ہونٹوں پر دعائیں تھیں۔ آخر دل چاک کر دینے والی رخصت کی گھڑی آ پہنچی۔ سید مودودی اپنے رفقا کو سلام اور خدا حافظ کہہ کر جیل کے افسر کے ہمراہ چلے تو سب کی آنکھیں ان کا تعاقب کر رہی تھیں۔ ان کے سراپا کو پیار بھری نظروں سے دیکھ رہی تھیں کہ شاید اس عظیم انسان کو دوبارہ دیکھنا نصیب نہ ہو جو پھانسی کے تختے کی طرف اتنے اطمینان سے جا رہا تھا۔

تھوڑی دیر بعد ایک وارڈر آیا۔ اس کے پاس سید مودودی کے کپڑے، ٹوپی اور جوتے تھے۔ اس نے بتایا کہ پھانسی کے سزایافتہ قیدی اپنے کپڑے نہیں پہن سکتے اور نہ اپنی چیزیں رکھ سکتے ہیں۔ ان چیزوں کو دیکھتے ہی سیلاب جذبات کا بند ٹوٹ گیا۔ میاں طفیل محمد اور سید نقی علی سسکیاں لے کر رونے لگے اور دونوں خدا کے حضور دعا مانگنے کے لئے جائے نماز پر آکھڑے ہوئے۔ مولانا امین احسن اصلاحی صاحب، چودھری محمد اکبر اور ملک نصر اللہ خاں عزیز جو پہلے سے سر بسجود تھے، قلب کی گہرائیوں سے اور پورے خلوص کے ساتھ انہوں نے التجائیں کیں، گڑ گڑائے، آنسوؤں اور آہوں کے ساتھ وحدہ لا شریک لہ کے حضور درخواست کی: ”ہم تجھی سے مدد چاہتے تھے۔“ ایسی عاجزی، خلوص قلب اور آہ وزاری کے ساتھ مانگی ہوئی ان نیک بندوں کی دعاؤں کو عرش الہی سے قبولیت مرحمت ہوئی۔

خداوند کریم، رحمن و رحیم نے ان کی دعا سن لی تھی۔ سید مودودی دیوانی گھر سے نکلے تو جیل کے افسر نے انہیں تسلی

دینے کے لیے کہا کہ: ”آپ گھبرائیے نہیں۔“ سید صاحب نے جو جواب دیا وہ ان کے قلبِ مؤمن کا آئینہ دار ہے، کہ جس میں اللہ کے سوا کسی کے خوف کی رمت تک نہیں ہوتی، انہوں نے کہا:

”صاحب! مجھے کوئی فکر نہیں ہے، میں نے جس راہ میں قدم رکھا ہے اس کے متعلق اول روز سے جانتا تھا کہ کچھ پیش آ سکتا ہے۔ مجھے یہ تسلی ہے کہ جس کی دی ہوئی یہ جان ہے اسی کی راہ میں قربان ہونے کا شرف اس کو حاصل ہو رہا ہے۔“ (چراغِ راہ اکتوبر ۱۹۵۳ء ص ۷۵)

یہ کہتے ہوئے سید صاحب باوقار انداز میں قدم اٹھاتے ہوئے خاموش لیکن مطمئن چہرے کے ساتھ آگے بڑھتے رہے۔ بالآخر میرک نمبر ۱۴ آگئی اور سید مودودی پھانسی کی کوٹھڑی میں داخل ہو گئے۔

شوش کا شیریں نے لکھا ہے: ”مولانا مودودی کا کرکٹر مثالی ہے۔ انہوں نے موت کی سزا پر جس ایمان کا ثبوت بہم پہنچایا، اس پر جتنا فخر بھی کیا جائے اتنا ہی کم ہے۔ ہر شخص اتنے ثبات کے ساتھ موت کی کوٹھڑی میں داخل نہیں ہو سکتا۔“ (مولانا مودودی اپنی اور دوسروں کی نظر میں، محمد یوسف بھٹہ، ص ۳۸۸)

سید مودودی پھانسی کی چھوٹی سی کوٹھڑی میں داخل ہوئے جس کا فرش کچا تھا۔ ایک چھوٹا سا بلب روشن تھا۔ سید صاحب نے دیکھا کہ وہاں قرآن مجید رکھنے کے لئے کوئی اونچی جگہ موجود نہیں۔ اس لئے پاس ادب و احترام کے جذبے سے اپنے کپڑوں کے ساتھ اسے بھی واپس کر دیا۔ سید صاحب کو جیل کے چار خانہ کپڑے دیئے گئے۔ انہیں یہ دیکھ کر تعجب ہوا کہ پاجامے میں کمر بند نہیں تھا۔ اس خیال سے کہ رات کے وقت لباس نکالنے والے سے بھی بھول ہو گئی، کمر بند کا مطالبہ کیا۔ جواب ملا کہ پھانسی کے قیدی کو کمر بند نہیں ملا کرتا، کیونکہ بعض اس سے خودکشی کر لیتے ہیں۔

سید صاحب نے متبسم چہرے کے ساتھ کہا: ”جس شخص کو شہادت نصیب ہو رہی ہو، وہ احمق ہے اگر خودکشی کر کے حرام موت مرنے کی کوشش کرے۔“

لیکن جیلر نے کہا کہ وہ قانون کی پابندی پر مجبور ہے اور ازار بند

نہیں دے سکتا۔ چنانچہ سید صاحب نے پاجامے کو گرہ لگا کر باندھا۔ لباس کی تبدیلی سے فارغ ہوئے تو اطمینان سے کھانا کھایا۔ کوٹھڑی کے جنگلے سے باہر رکھی ہوئی پانی کی صراحی سے وضو کیا، عشا کی نماز ادا کی اور اپنے پروردگار سے صبر و استقامت اور تحریکِ اسلامی کی بقا و ترقی کی دعائیں کیں۔ پھر زمین پر بچھے ہوئے دو فٹ چوڑے اور ساڑھے پانچ فٹ لمبے ٹاٹ کے بستر پر اطمینان اور سکون سے لیٹ گئے۔ رات بھر پہرے دار انہیں حیرت سے دیکھتے رہے، کہ یہ کیسا غیر معمولی انسان ہے جو پھانسی کا حکم پا کر ایسا مدھوش سویا ہے کہ گویا اس کے کندھوں پر سے دنیا جہاں کے غموں کا بوجھ اتر گیا ہے، گویا وہ بڑی بے نیازی سے بقول علامہ اقبال، زبانِ حال سے کہہ رہا ہو:

رہے ہیں اور ہیں فرعون میری گھات میں اب تک
مگر کیا غم کہ میری آستیں میں ہے یدِ بیضا
وہ چنگاری خس و خاشاک سے کس طرح دب جائے
جسے حق نے کیا ہو نیتاں کے واسطے پیدا

۱۲ مئی ۱۹۵۳ء کو یعنی اگلے روز کراچی کے روزنامہ ”جنگ“ نے اس خبر کو شہ سرخی بنایا: ”فوجی عدالت نے مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی کو سزائے موت سنائی، اس روز اخبار کے ادارے کا عنوان تھا: ”پوری قوم دہل گئی۔“ روزنامہ ”انجام“ کراچی نے ادارے کی جگہ جلی حروف میں صرف ”مولانا مودودی کو سزا“ کے الفاظ سیاہ حاشیے میں دیئے، گویا غم اتنا شدید ہے کہ قلم اس کے اظہار سے عاجز ہے۔ اسی طرح بے شمار اخبارات اور رسائل و جرائد نے اس سزا پر اپنے رنج و غم کا اظہار کیا۔ سزائے موت کی خبر جنگل کی آگ کی طرح اخبارات میں آنے سے پہلے ہی لاہور، کراچی اور بڑے شہروں میں پھیل چکی تھی اور اس نے لوگوں کو ہلا دیا تھا۔

غمِ متاعِ عزیز

ہر شخص سید مودودی کی سزا کی خبر سن کر مجسم سوال تھا۔ اف اللہ، کیا اتنے بڑے عالمِ دین کو تختہ دار پر لٹکا دیا جائے گا؟ کیا اتنا بڑا مفکرِ اسلام ہم سے چھین لیا جائے گا؟ سب کی آنکھیں اشک بار ہوئیں تو دل و جگر

فکار ہوئے، عالم اسلام کے مسلمان حیرت میں گم تھے کہ یا الہی! جس ملک کو خدا، رسول اور کلمہ طیبہ کے نام پر حاصل کیا گیا تھا، کیا اس کی حکومت اس روشنی کے مینار کو اپنے ہاتھوں سے تباہ و برباد کر دے گی؟

تاہم جماعت اسلامی کے عام ارکان اور کارکنوں کے لئے آشوبِ غم میں ڈوبے رہنے کا نہیں بلکہ عمل کا وقت تھا۔ جماعت اسلامی کے لاکھوں ہم درد حرکت میں آ گئے۔ وہ بازاروں، کالجوں، دفاتروں اور گلی کوچوں میں نکل آئے اور انہوں نے لوگوں کو اس ظلم اور نا انصافی کی خبر دی۔ بلا مبالغہ ہزاروں ٹیلی گرام پاکستان کے گورنر جنرل، وزیراعظم اور کمانڈر ان چیف کو ارسال کئے، جن میں مطالبہ کیا گیا کہ سید مودودی کو سزائے موت نہ دی جائے۔ جگہ جگہ احتجاجی جلسے ہوئے اور متعدد شہروں میں ہڑتال ہوئی۔

اس احتجاج میں عالم اسلام کے دل بھی پاکستانیوں کے ساتھ دھڑک رہے تھے۔ عراق میں اہلسنت والجماعت کے رہنما امجد الزہاوی اور شیعان عراق کے مجتہد اعظم محمد الخالصی نے سزا کی تنبیخ کا مطالبہ کیا۔ اخوان المسلمون کے قائدین نے مصر اور فلسطین کے مفتی اعظم امین الحسینی مرحوم نے ٹیلی گرام دیا کہ وہ امید کرتے ہیں کہ حکومت پاکستان دانش مندی سے کام لے گی اور استاذ مودودی کی سزا کو منسوخ کر دے گی۔ انڈونیشیا کے عسلیٰ انصاری نے ساٹھ اسلامی پارٹیوں کی طرف سے ٹیلی گرام دیا اور لکھا کہ اگر پاکستان کو سید مودودی کی ضرورت نہیں تو دنیائے اسلام کو ان کی ضرورت ہے۔ دمشق میں پاکستانی سفارت خانے پر مظاہرہ کیا گیا۔ قاہرہ، بغداد اور دمشق کے اخبارات نے سزا کی منسوخی کا مطالبہ کرتے ہوئے سید صاحب کو خراج تحسین پیش کیا اور انہیں صف اول کا ایک جلیل القدر مجاہد صادق، دور ابتلا سے گزرنے والا مجاہد ابو الاعلیٰ مودودی قرار دیا۔ برطانیہ میں مقیم مسلمانوں اور طلبہ نے احتجاجی ٹیلی گرام بھیجے۔ الجزائر کے مسلمانوں کے جذبات کی ترجمانی کرتے ہوئے وہاں کے صدر جمعیت العلماء اور اخبار البصائر کے مدیر محمد البشير الابراہیمی نے آٹھ صفحات پر مشتمل ایک بسیط ادارہ لکھا ”من هو المودودی؟“ (”مودودی کون ہے“) اور اس میں سید صاحب کا تعارف، اسلامی

خدمات، حکومت سے سیاسی اختلاف اور سزا پر زور احتجاج قلم بند کیا۔ کانپور (بھارت) کے جریدہ ”سیاستِ جدید“ نے ”آخری سلام“ کے عنوان سے ادارہ لکھا، جسے ان الفاظ پر ختم کیا: ”آپ رسولِ پاک کی امت کی راہبری کے لیے پھانسی کے تختے پر چڑھ رہے ہیں۔ آپ ملکِ العلام کے پاس جا رہے ہیں۔ جب وہ آپ سے سوال کرے کہ آپ کو کس گناہ پر قتل کیا گیا؟ تو آپ یہ ضرور کہیے گا کہ آپ کے حبیبِ پاک کو خاتم النبیین ثابت کرنے کے جرم میں مجھے پھانسی کے تختے پر لٹا دیا گیا۔ مولانا مودودی! آپ کو دور افتادہ ہندوستانی مسلمان کا آخری سلام۔“

عمر عثمانی مدیرہ ماہ نامہ ”جنگل“ نے ”آہ!“ کے عنوان سے لکھا کہ اس خبر سے دل کو اتنا صدمہ اور رنج پہنچا ہے کہ صرف غالب نے اس کی ترجمانی کی ہے:

رگ سنگ سے ٹپکتا، وہ لہو کہ پھر نہ تھمتا
جسے غم سمجھ رہے ہو، وہ اگر شرار ہوتا
کہ جاں مرنی نہیں مرگِ بدن سے

۱۲ مئی کی صبح شیخ سلطان احمد، اجپھرہ میں سید مودودی کی رہائش گاہ پر پہنچے، جو جماعت اسلامی کے حلقے میں ان دنوں ”مرکز“ کے نام سے معروف تھی۔ شیخ صاحب، بیگم سید مودودی کو تسلی کا پیغام دینے کے لئے آئے تھے، جن کے پاس لاہور شہر کی تقریباً سات سو خواتین اظہارِ ہمدردی کے لئے پہنچ چکی تھیں۔ وہ صبر و سکون کی تصویر بنی ہوئی تھیں۔ انہوں نے اس روز بھی بچوں کو تیار کر کے اسکول بھیجا، جس روز پورے پاکستان میں ان بچوں کے والد گرامی کے لئے سزائے موت کے حکم پر کھرام مچا ہوا تھا۔ سلطان صاحب اپنے آپ کو ہچکیاں اور سسکیاں سننے کے لیے تیار کر رہے تھے، لیکن جب پردے کے پیچھے سے بیگم محمودہ مودودی کی صاف اور بلند آواز میں سلام کی آواز آئی، تو اس میں نہ کمزوری تھی اور نہ کپکپاہٹ۔ شیخ سلطان احمد صاحب نے تسلی کے الفاظ کہے تو انہوں نے کہا:

میں ہر حال میں تقدیر پر شاکر ہوں۔ خدا کا شکر ہے کہ میں تو کیا، میرے بچے تک بالکل ہراساں نہیں ہیں، حالانکہ ان کو سب کچھ معلوم ہو

چکا ہے۔

اپیل نہ کی جائے؟“

لیکن سید مودودی نے، کہ جن کا ایمان اس بات پر ہے کہ جان مرقی نہیں مرگ بدن سے یہ جواب دے کر بات ہی ختم کر دی:

بھئی، مجھے تو یہ بات پسند نہیں۔ ورنہ میں حکم دینے کا حق تو نہیں رکھتا۔ میں نہیں چاہتا کہ میری طرف سے یا میرے خاندان ان کے کسی فرد کی طرف سے یا خود جماعت کے اندر یا باہر کی طرف سے کوئی رحم کی درخواست لیش کی جائے۔

سید صاحب کے ان الفاظ سے جوان کی استقامت اور استقلال کی دلیل ہیں، ہمیں شیکسپیر کے ڈرامے میں جو لیس سیزر یاد آتا ہے، جس نے اپنی موت سے چند لمحے پہلے کہا تھا:

راخ وغیرہ متبدل ہوں میں قطبی ستارے کی مثال کہ جس کی صفت دوام و ثبات میں نہیں کوئی ثانی پورے آفاق میں۔

مرگِ با شرف کا انتخاب

سید مودودی کے یہ الفاظ بڑے بڑے پوسٹروں پر شائع ہو کر پاکستان کے کوچہ کوچہ اور گلی گلی میں پھیل گئے اور عزم و ہمت کا یہ فقرہ خاص و عام کے دل میں اتر گیا..... میں مر جاؤں گا لیکن رحم کی درخواست نہیں کروں گا۔ اور اس روز ۲۱ مئی کو جب سنٹرل جیل کے یہ ملاقاتی لوٹے لگے تو سید مودودی نے اپنے بڑے بیٹے عمر فاروق کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر تسلی دیتے ہوئے وہ الفاظ کہے جو تاریخِ عزیمت کے اوراق پر جلی حروف میں درج ہو چکے ہیں:

بیٹا! ذرا نہ گھبرانا اگر میرے پروردگار نے مجھے اپنے پاس بلانا منظور کر لیا ہے، تو بندہ بخوشی اپنے رب سے جا ملے گا، اور اگر اس کا ابھی حکم نہیں تو پھر چاہے یہ الٹے لٹک جائیں، مجھ کو نہیں اڑکا سکتے۔ (ماہنامہ چراغِ راہ، اکتوبر ۱۹۵۳ء، ص ۹۸)

روشنی کا مینار

تاریخ اپنے آپ کو دہراتی ہے۔ قریباً ایسا ہی واقعہ ۳۳۹ ق۔ م کے موسم گرما میں بھی وقوع پذیر ہوا۔ عظیم یونانی فلسفی سقراط کو اس الزام میں سزائے موت سنا کر ایتھنز کے قید خانے میں ڈالا گیا تھا کہ وہ قومی

اس کے بعد شیخ سلطان احمد، اس صابر و شاکر خاتون کے شوہر، پھانسی کا انتظار کرنے والے سید مودودی کو ملنے سنٹرل جیل پہنچے۔ وہ لکھتے ہیں:

جیل کے بیرونی آہنی پھاٹک کی کھڑکی کھلی۔ سید ابوالخیر مودودی، عمر فاروق مودودی، سعید ملک صاحب، عبدالعزیز شرقی صاحب، صفدر حسن صدیقی صاحب اور میں آگے پیچھے جھک کر تاریک ڈبوڑھی میں داخل ہو گئے۔ اندر پہنچتے ہی پر شور مچنے پر کھڑکی اور اس کا قفل بند کر دیا گیا۔ سب کے ہاتھوں پر نشانی کی مہر لگائی۔ کافی آگے جا کر بائیں ہاتھ کی آخری کوٹھڑی میں ہم سب داخل ہو گئے۔ باہر ایک نگران بیٹھا تھا۔ سامنے لوہے کی موٹی سلاخوں کا دوسرا دروازہ تھا، جس پر بھاری تالا پڑا تھا۔ ہم کو دیکھ کر مولانا ابوالاعلیٰ مودودی حسب معمول کشادہ روئی کے ساتھ اٹھے اور آگے بڑھ کر سلاخوں کے باہر سے ہاتھ ملا یا۔ فرزند کے سر پر ہاتھ پھیرا اور اپنے مخصوص انداز میں ہر ایک کی خیریت پوچھنے لگے۔ سب لوگ نیچی نگاہ کیے کھڑے تھے اور ایک عجیب حجاب گفتگو میں حائل تھی۔

کچھ دیر بعد باتوں باتوں میں جب سلطان احمد صاحب نے سید صاحب سے یہ بات چھیڑی کہ سزائے موت کے خلاف اپیل کی جائے تو سید صاحب نے قولِ فیصل سنا دیا:

بھئی، میرا مسلک آپ کو معلوم ہے۔ میرے نزدیک ان لوگوں سے جو میرا اصل جرم خوب جانتے ہیں، معافی کا طلبگار بننے سے یہ زیادہ قابل برداشت ہے کہ آدمی پھانسی پر لٹک جائے۔ (ایضاً)

سلطان صاحب نے دلائل دیئے کہ: ”قرار داد مقاصد منظور ہو جانے کے بعد ان عدالتوں سے انصاف لینا جائز ہے۔ پھر یہ اپیل معافی کی نہیں ہوگی۔ اس کے بجائے اپیل قانونی نکات اور مقدمے کے حقائق کے زور پر ہوگی۔ اور پھر یہ بات بھی ہے کہ اپیل کمانڈران چیف کے پاس جائے گی جو کسی پارٹی کا آدمی نہیں ہے۔ اس کے علاوہ فوجی عدالت کی سزا حد شرعی تو نہیں ہے۔ یہ تو صریح ظلم ہے، اس کے خلاف کیوں

دیوتاؤں کو نہیں مانتا، نئے خیالات پھیلاتا اور نوجوانوں کو گمراہ کرتا ہے۔ اس نامور معلم نے سوال و جواب کے مخصوص اسلوب استدلال سے غور و خوض، فکر اور تنقید کی راہیں کھول دی تھیں، جن سے توہمات کا مندر ٹوٹ گیا تھا۔ ایتھنز کے بااثر لوگوں کو یہ سچائی کڑوی لگی۔ وہ بے راہ روی کی زندگی چاہتے تھے جس میں ان پر کوئی احتساب نہ ہو۔ انہوں نے سقراط کا زہر کا پیالہ دیا تو اس کے ہاتھوں کو ذرا بھی لرزش نہ ہوئی۔ تو کیا سقراط معدوم ہو گیا؟ اس کی تعلیمات مٹ گئیں؟ اس کا نام مجھ ہو گیا؟ نہیں، وہ امر ہو گیا۔ اس کی زندگی کے درپے لوگوں کا نام و نشان تک مٹ گیا۔

تاریخ شاہد ہے کہ سید مودودی نے تختہ دار کو خوشی سے چوم کر مرگ با شرف کو چن لیا۔ لیکن پھر ان کے خون کے پیاسوں کے اپنے قدم ڈمگا گئے۔ ان کی سزائے موت کو دو روز بعد ہی عمر قید میں تبدیل کرنا پڑا۔ برسرِ اقتدار طبقے نے اپنے دامن کو اس دھبے سے ہمیشہ کے لئے داغ دار کر لیا۔ جس آمرِ مطلق ملک غلام محمد نے نشہ اقتدار میں یہ سارا کھیل رچایا تھا، اس کی بد زبانی، دستور شکنی اور ملک دشمن کے بارے میں سبھی منورخ یک زبان ہیں۔ اس کی عبرتناک موت زبان زد خاص و عام ہے۔ گنتی کے چند ہی لوگوں کو یہ علم ہو گا کہ آج اس کی قبر کہاں ہے؟ آمروں کا یہی انجام ہوا کرتا ہے۔

حکومتیں ایک ایک کر کے بدلتی گئیں اور اکثر نے سید مودودی کی پہلوں سے بڑھ کر مخالفت کی، لیکن سید مودودی روشنی کے مینار کی طرح اپنے موقف پر ڈٹے رہے۔ جو سمندر کے درمیان کھڑا ہوتا ہے، اور طوفان اسے تھپیرے مارتے رہتے ہیں، وہ ان تھپیروں سے بے نیاز، سر بلند و سرفراز، مضبوط قدم جمائے راہ دکھاتا رہتا ہے۔ اسی طرح سید مودودی بھی ہر دور کی مخالفت، الزامات و اتہامات اور دارورسن کے خطرات کے باوجود اپنے مشن پر پورے ثبات سے ڈٹے رہے ہیں اور اسلام کی نشاۃ ثانیہ کی راہ ہموار کرتے رہے ہیں۔

سید مودودی کے افکار و خیالات سے بلا مبالغہ لاکھوں انسانوں کی زندگیوں میں انقلاب آ گیا۔ انہوں نے اعلیٰ قائدانہ صلاحیتوں سے پاکستان کی سب سے فعال سیاسی اور دینی جماعت کو مستقل بنیادوں پر

اٹھایا۔ جس رفتار سے جماعت اسلامی کے اثر و نفوذ کا دائرہ وسیع ہوتا جائے گا، انقلابی افکار کا سیلاب پاکستان سے پھیل کر دیگر مسلم آبادیوں تک پہنچے گا اور پھر ساری دنیا میں اسلام کا پیغام ایک انقلابی تحریک کی صورت میں آگے بڑھتا جائے گا۔

سید مودودی کی کتابیں کئی مقامی اور بین الاقوامی زبانوں میں ترجمہ کی جا چکی ہیں، حتیٰ کہ ان کی زندگی اور افکار پر دنیا کی بلند پایہ یونیورسٹیوں میں ریسرچ ہو رہی ہے۔

ان کی اسی مقبولیت کو دیکھ کر فرعونہ وقت کی جبینوں پر بل پڑتے رہے ہیں، اور کچھ اغراض پرست لوگوں کا یہ پیش بن گیا تھا کہ وہ اس چاند پر تھوکنے کی کوشش میں لگے رہتے تھے۔ دوسری طرف سید مودودی ان مخالفتوں سے بے پروا ہو کر نوجوان نسل کی تعمیر افکار اور تشکیل سیرت اسلام میں مصروف رہے اور ایک محنتی مالی کی طرح خیالات و افکار کی زمین میں تخم ریزی کرتے رہے۔

ان کے عظیم علمی کام یعنی مستقل اہمیت کی سو سے زیادہ اسلامی تحقیقی کتابوں کی تصنیف اور عملی کام یعنی تیس سال تک جماعت اسلامی کی تنظیم و سربراہی، سیاسی امور میں مشغولیت اور تربیت و رہنمائی کو دیکھ کر حیرت ہوتی ہے کہ کیا اتنا کام اس ایک شخص نے کیا ہے، جسے کبھی معاش فارغ البالی حاصل نہیں رہی، جس کے کاندھوں پر ایک بھرے پرے گھر کی ذمہ داریاں رہیں، جس نے چار سال آٹھ ماہ کا طویل عرصہ قید میں گزارا اور جو درگزر کا مستقل مریض رہا تھا، جس کے باعث اس کا علمی و عملی کام بار بار معطل ہو جاتا تھا۔

لا ریب یہ عقل و حکمت، یہ علم و عمل، یہ عزم و استقلال، یہ غفور و حلم اور یہ عزت و عظمت، اللہ عز و جل کی عنایت اور دین ہے۔ کوئی انسان اپنی محنت اور کوشش سے اس عالی مرتبے کو نہیں پہنچ سکتا تانہ بخشد خدائے بخشندہ۔

☆.....☆.....☆

نعت

یہ آنسو دل پہ گرتے کیوں نہیں ہیں رحمتِ عالم
یہ دل آخر کچھلتے کیوں نہیں ہیں رحمتِ عالم

سرو سامان کم ہے دشمنوں کی پیش قدمی ہے
ہمیں بدرواحد درپیش ہے پھر رحمتِ عالم
فقط اک آپ کا نقشِ قدم ہے جس پہ چلنے میں
بھلائی دونوں عالم کی ہے مضمحل رحمتِ عالم

گڑھے ہیں آگ کے گرنے سے روکے کون اب ہم کو
کہاں اب آپ کا ہے دستِ الفت رحمتِ عالم
ہمیشہ آپ پر بھیجے درودِ پاک یہ امت
ہمیشہ آپ پر ہو رب کی رحمت، رحمتِ عالم

بشریٰ فیصل

غزل

ہے دل میں ایک داغ کی صورت غموں کا مَس
اور اس پر مستزاد یہ میری شبِ قفس
بنجر زمین کی گود میں پھیلے ہیں خار و خس
اے ابرِ برشگال ذرا ٹوٹ کے برس
دل بجھ گیا ہے اور ہے یہ روح مضطرب
جب سے بساطِ حُسن پہ ہے منصبِ ہوس
چیزوں کا آج باقی نہیں کوئی امتیاز
زنجیر کی صدا ہو یا آوازِ جرس
میں حادثے کو کیسے نئی رُت کا نام دوں
اور کس سے حالِ زار کہوں میرے ہم نفس
یہ تلخیاں تمام تو خوشیوں کے دم سے ہیں
شیرِ تنی حیات ہے دل کے غموں کا رس

کرامت بخاری

غزل

ہنر ہمیں کوئی ایسا مگر سکھائے کون
بلا سب کوئی روٹھے تو پھر منائے کون
تیرے بغیر اگر زندگی ہے بوجھ تو پھر
بھلا بتا کہ اسے عمر بھر اٹھائے کون
کسی کا قرب ملے یہ کمال کب ہے مگر
انا کی راہ کے دیوار و در کو ڈھائے کون
سنا ہے میں نے تری بات میں فسوں ہے بہت
یہ بات ہے تو تری بات میں نہ آئے کون
سنا ہے پاؤں بھی تیرے زمیں پہ ٹکتے نہیں
تو یونہی راہ میں پلکیں بھلا بچھائے کون
سنا ہے خواب بھی سارے ترے پرائے ہیں
تو پھر بتا کہ تجھے خواب میں جگائے کون
ترے خیال پہ پہرے ہیں غیر کے تو بتا
تخیلات کا دروازہ کھٹکھٹائے کون
سنا ہے تیری ہنسی میں بھی تلخیاں ہیں تو پھر
ترے لبوں کے کناروں پہ کپکپائے کون
وفا کی راہ میں یہ جان و دل ہیں قرض مگر
حبیب تیرے سوائے اسے چکائے کون

حبیب الرحمن

رنج تو یہ ہے!

میری اک آہ پہ جو شخص تڑپ اٹھتا تھا
جس کے دل میں مری تکلیف پہ درد اٹھتا تھا

جو مرے ایک ہی آنسو پہ پگھل جاتا تھا
جس کی میں ایک تسلی سے سنبھل جاتا تھا

اس کو دنیا کے حوادث نے بدل ڈالا ہے
جذب و احساس کا ہر رنگ کچل ڈالا ہے

رائیگاں جاتا ہے اب پہروں کا رونا میرا
ہر نفس بوجھ ہے بیکار ہے ہونا میرا

اس کا کچھ غم نہیں کیوں مجھ کو نہ سمجھا اس نے
رنج تو یہ ہے سمجھنا ہی نہ چاہا اس نے

خواہشیں میری عبث، آرزو باطل ٹھہری
یہ محبت تو مری سوچ کی قاتل ٹھہری

آمنہ رمیسا زاہدی

غیبی دروازہ

گا۔ روز روز تو حق مانگنے میں بھی نہیں آسکتا۔“

بات مکمل کر کے اس نے ٹھاہ سے دروازہ بند کیا اور ساتھ ہی بشیراں کی آس امیدوں کا دروازہ بند ہو گیا۔ جیسے آنکھوں میں مٹھی بھر مٹی ڈالی گئی ہو۔ پورا جسم پسینے میں نہا گیا اور چکرا کروہیں گر گئی..... آنکھیں بند ہوتے ہوتے ہوش و خرد کی دنیا سے وقتی طور پر بیگانہ ہوتے ہوئے اس کے ہونٹوں پر ایک ہی پکار تھی۔

زمین و آسمان کے خزانوں کے مالک کوئی غیبی دروازہ میرے لئے بھی کھول دے میری مشکل آسان ہو جائے..... اٹھارہ سو پچھتر روپے۔ صرف اٹھارہ سو پچھتر روپے..... ہزار روپے موجودہ ہیں..... بس اٹھارہ سو پچھتر روپے مزید.....“

داستان غربت بشیراں کی بھی وہی تھی جو ساری بے کس اور بے بس بیواؤں کی ہوتی ہے۔ خاوند نشئی تھا اللہ جانے کیسے مر مرا گیا۔ دو بچے جس سکول میں زیر تعلیم تھے اسی سکول میں وہ صفائی ستھرائی کا کام کرتی تھی۔ پوری بستی غریب غرباء کی تھی کپڑا سلواتے تو تب تک پیچھا نہ چھوڑتے جب تک وہ خود پہننے والے کی جان نہ چھوڑتا۔ سلائی کا ہنر کبھی تھا ہی تو زنگ آلود ہو گیا۔ اسی سکول کے پاس فضل گجر کا ڈیڑھ مرلے کا گھر تھا۔ ہزار روپے کرائے کے اور بجلی کا بل آدھا۔ تھی تو نوزی بے انصافی خود تو مالک مکان بجلی کا بے دریغ استعمال کرے اور وہ خود ایک پنکھے ایک بلب کے ساتھ آدھے بل کی ذمہ دار ہو گئی۔ پر کیا کریں۔ کلجگ ہے بھئی کلجگ.....! پچھلے ایک ڈیڑھ ماہ میں وہ بس چار چھ دفعہ ہی سکول گئی..... پہلے ایک بچہ بیمار ہوا پھر دوسرا پھر خود بیمار ہو گئی۔ ہفتے میں بمشکل ایک آدھ دفعہ جانا ہوا اس کے پیسے کس سے مانگتی.....! گھر میں گنتی کے دو بستر اور اڑھائی برتن تھے، کیا نیچتی اور کیا رکھتی۔

”بہن! بشیراں ذرا دروازے پر آکر میری بات سنو۔“ مالک مکان فضل گجر نے دھڑ دھڑ دروازہ پیٹتے ہوئے کہا۔ بس یوں سمجھئے کہ اعلان بگل بجایا۔

نفاہت اور بخار کا شکار بشیراں نے دوپٹے کے پلو سے اپنے ہاتھ پونچھے اور جل تو جلال تو کا ورد کرتی باہر آئی۔

”جی بھیا فضل.....“ فکر مندی سے بشیراں نے جواب دیا۔

فضل پر تو اللہ کا فضل ہے لیکن لگتا ہے تیرا حال مندا ہی ہے آج میرا تیسرا چکر ہے، دو ماہ کا کرایہ اور تین ماہ کا بجلی کا بل جمع ہے تیری طرف۔ خالی ترس کھانے سے تو پیٹ نہیں بھرتا، بہن میرے۔ کچھ دانہ چوگا تو اس پانی پیٹ کے لئے کرنا ہی پڑتا ہے۔ اگر نہیں کر سکتی تو نئے کرائے دار بننے کے لئے لائن لگی ہے آج آخری دفعہ بتا دے کب تک انتظار کروں؟ کھر دے لہجے میں فضل نے بات مکمل کی۔

آپ بالکل ٹھیک کہتے ہیں بھاجی، پہلے کا چھت سے گرا پھر منی کے لاکڑا کا لڑا نکل آیا۔ سکول گئی نہ تنخواہ ملی۔ کل انشاء اللہ جیوں، مروں ہر حال میں سکول جانا شروع کروں گی.....“

بشیراں نے من من کرتے ہوئے بات مکمل کی۔

”یہ بات تو پچھلے چکر میں بھی سنائی تھی تم نے۔ آج کی نئی بات سناؤ۔“ سفاکی کے ساتھ کہا۔

”بیماروں کو بھگتا بھگتا کے خود بیمار ہو گئی تھی، ٹائیفائیڈ ہو گیا ہے مجھے“ بے بسی سے بشیراں نے وضاحت کی۔

”او..... ہو..... اس کا مطلب ہے اگلے ماہ کا کرایہ بھی نہیں ملے گا۔ نہ..... نہ..... کل دن کے دس بجے تک کرائے کا بندوبست ہونا چاہیے ورنہ گیارہ بجے نئے کرائے داروں کا سامان ڈیوڑھی میں پڑا ہو

کمرؤں کا کوارٹر بنا ہوا ہے اگر تم وہاں شفٹ ہو جاؤ، میری غیر موجودگی میں میرے بچے پریشان نہیں ہوں گے میں بھی مطمئن رہوں گی کہ ان کے پاس کوئی ذمہ دار فرد موجود ہے۔ یہ پوچھنے بلکہ بتانے کے لئے تمہارے پاس آئی تھی تو تم بے ہوش پڑی تھیں۔

اب جلدی سے ٹھیک ہو جاؤ ہم نے توشفتنگ شروع بھی کر دی ہے.....“ انہوں نے اٹھتے ہوئے کہا۔

”جی ٹھیک ہے.....“ سر سے منوں وزنی بوجھ اتر گیا، بشیراں دوبارہ زندہ ہو گئی..... ”پچلیے میڈم صاحبہ.....“ اس نے بیڈ سے ٹانگیں نیچیں کیں.....

”اوہو..... ابھی تم یہیں رہو، نرس آ کر چھٹی دے گی تمہیں..... اور یہ.....“ انہوں نے اپنا پرس کھولا..... ہم نے تمہیں مستقل ملازم کے طور پر رکھا ہے تو پچھلے دو ماہ کے یہ بقایا جات ہیں تمہارے، یہ لو.....“ انہوں نے کڑکڑاتا ہوا نیلا نوٹ اسے تھمایا..... کانپتے ہاتھوں سے بشیراں نے نوٹ پکڑا۔ اس کے ساتھ ہی چڑمڑ سے دو تین نوٹ اور تھے۔ اس نے جلدی سے گنتی کی۔ کل رقم اٹھارہ سو پچھتر روپے تھی۔

صرف ایک دفعہ پکارنے پر..... کہ الہی غیبی دروازہ کھول دے، میری مشکل آسان کر دے..... غیبی دروازہ کھل چکا تھا۔ مفت میں نیا ٹھکانہ مل چکا تھا۔ مالک مکان کو دینے کے لئے اٹھائیس سو پچھتر روپے کی ضرورت تھی، ہزار پہلے سے موجود تھا۔ باقی رقم زمین و آسمان کے خزانوں کے مالک نے بھجوا دی تھی اور وہ گم سم بس یہی سوچے جا رہی تھی۔ پہلی دفعہ مانگنے پر اس نے وہاں سے دیا جہاں سے وہم و گمان بھی نہیں تھا۔

اور جو اسی کے در سے مانگتے ہیں.....

اور مانگتے ہی رہتے ہیں.....

ان کو وہ کیا کیا کچھ نہیں دیتا ہوگا!

☆.....☆.....☆

مالک مکان کو ان سب حالات کا علم تھا پر وہ بھی سچ کہہ رہا تھا اگر مالک مکان ترس کھائے تو کمائے کہاں سے! اس بار وہ آخری دفعہ آنے اور سامان نکال پھینکنے کی دھمکی دے گیا تھا۔ آس امید کسی جھروکے سے اندر آتی نظر نہیں آرہی تھی۔ تصور ہی میں اپنا سامان سڑک پر پھینکا ہوا دیکھ کر وہ گرتی چلی گئی..... اللہ غیبی دروازہ کھول دے..... غیبی دروازہ!

آنکھ کھلی تو ناگوار سی بو اس کے نتھنوں سے نکلرائی..... سپرٹ..... منچر آئیوڈین..... ادویات..... ہسپتال..... نرس..... اور پاس بیٹھا مانوس سا چہرہ میڈم افشاں کا، جہاں وہ کام کرتی تھی اس کی ہیڈ مسٹرس، اس نے اٹھنا چاہا مودب ہو کر بیٹھنا چاہا لیکن میڈم صاحبہ نے اشارے سے روک دیا اور اس کے قریب آئیں۔

”کیسی ہو بشیراں؟“

”بہتر ہوں“ وہ سوکھے لبوں پر زبان پھیرتے ہوئے بولی۔

نقاہت کا شدید احساس تھا.....

”میں کہاں ہوں میڈم صاحبہ اور میرے بچے؟“ وہ بولی۔

”سب ٹھیک ہیں۔ میں تو اتفاق سے تمہارے پاس آئی تھی، موبائل فون تمہارے پاس ہے نہیں، ضروری کام تھا تم سے، تمہارا دروازہ کھلا تھا اندر آ کر دیکھا تو تم بے ہوش پڑی تھیں۔ ڈرائیور سے کہہ کر ایسبولینس منگوائی اور ادھر لے آئی۔ کیا بات ہے ٹھیک نہیں ہوئیں تم؟“

بھئی جلدی سے ٹھیک ہو جاؤ۔ مجھے تو ضروری کام ہے تم سے،“ انہوں نے لہجے میں بشارت پیدا کرتے ہوئے کہا۔

”جی حکم کریں.....“ اس نے آہستہ سے کہا۔

”بھئی! بشیراں بات یہ ہے کہ پشاور والے سانچے کے بعد تمہیں تو پتہ ہی ہے حالات کیسے مشکل ہو گئے ہمارے لئے، ہمارے سکول کی دیواریں بھی چھوٹی ہیں کیمرے کا بھی انتظام یہاں نہیں ہو پا رہا تھا تو ہم نے سکول کچھ فاصلے پر شفٹ کر لیا ہے۔ بلڈنگ بڑی ہے اوپر والے حصے میں گھر ہے۔ مجھے آئے روز کسی نہ کسی میٹنگ میں جانا پڑتا ہے۔ بچے اکیلے رہ جاتے ہیں میں نے یہ سوچا بھی تم ہو تو ایماندار..... تمہاری بھی ضرورت پوری ہو جائے گی ہماری بھی..... سکول کے ایک طرف دو

عزت

اسے اور اس کے گھر والوں کو دھتکارا نہ جائے۔ وہ سب بھی انسان تھے۔ کیا ان کو وہ عزت بھی نصیب نہیں جو امیروں کے جانوروں تک کو مل جاتی ہے!

اس دن زمیندار کے بیٹے کی شادی تھی۔ حویلی میں مہمانوں کی آمد آمد تھی۔ کام بہت بڑھ گیا تھا۔ زمیندار نے چھوٹے موٹے کاموں کے لئے شان کو بلا بھیجا۔ چھوٹی بہن سکی نہ کولے کر، شان حویلی میں صبح سے شام تک کئی کام نہ مناتی رہی۔ خوبصورت، رنگ برنگ کپڑے پہنے مہمان بچے ادھر ادھر تنلیوں کی طرح اڑتے پھر رہے تھے۔ شان کی بہن سکی نہ حسرت سے انہیں ٹکڑے دیکھ کر دیکھ جاتی۔ آم کے پیڑ پر سب جھولا جھول رہے تھے۔ جھولا خالی ہونے پر سکی نہ چاہا کہ وہ بھی جھولے، پر زمیندار کی چھوٹی لڑکی نے لپک کر اس کا ہاتھ کھینچا اور گندا کہہ کر فوراً اتار دیا اور وہاں سے فوراً ہٹ جانے کو کہا۔

شانو چپ چاپ دیکھ گئی۔ مہمان بچے آپس میں بیٹھے رنگین تصویروں والی کتاب دیکھ رہے تھے۔ کھیل کے بعد نہ جانے کیسے وہ کتاب وہیں بھول کر اندر چلے گئے۔ سکی نہ کتاب اٹھا کر بڑے شوق سے ورق گردانی کرنے لگی کہ ایک بچے نے آکر اس کے ہاتھ سے کتاب چھینی تو صفحہ پھٹ گیا۔ بس پھر کیا تھا۔ زمیندار کی چھوٹی لاڈلی بیٹی نے وہ واویلا مچایا، غلطی سکی نہ کی نہ تھی، پر وہ ہنگامہ کھڑا کیا گیا کہ اسے دھکا دے کر حویلی سے نکال دیا گیا۔ شانو تڑپ کر رہ گئی۔ کیا بچوں کی نظر میں بھی ان کی کوئی عزت نہیں؟

گھر آکر بھی اس کا دل خون کے آنسو روتا رہا۔ اپنے ماں باپ سے محبت شفقت نہ ملی تھی تو دوسروں سے کیا گلہ شکوہ۔ پردل تھا کہ کڑھتا جاتا تھا۔ کئی بار اس کا دل چاہا کہ وہ اپنی زندگی کا خاتمہ کرے پر ہر بار نہ جانے کیا چیز اس کو اس حرکت سے باز رکھتی۔

رات تاریک تھی۔ ادھورا چاند اس تاریکی کو دور کرنے کی کوشش کرتا مگر بادل آکر اس کو ڈھانپ لیتے۔ چاند تیزی سے بادلوں کو پیچھے دھکیلتا، آگے بڑھتا پر بادل پھر اس پر حاوی ہو جاتے اور ہر سوتا کی پھیل جاتی۔

اس سے زیادہ تاریکی شانو کے دل پر چھائی ہوئی تھی۔ اس کے چہرے کی معصومیت اور تمکنت پر چھایا کرب اس کی محض سولہ سال کی بالی عمر سے کہیں بھی میل نہیں کھاتا تھا۔ کھلے آسمان کے نیچے، چار پائی پر پڑی، آسمان کو نکلتی، نیند اس کی آنکھوں سے کوسوں دور تھی۔

غربت، بھوک، مفلسی اور بے بسی نے اسے وقت سے پہلے بہت کچھ سکھا اور سمجھا دیا تھا۔ لیکن سب سے زیادہ جو بات اسے اذیت دیتی تھی وہ اس ننھے سے دل کی واحد خواہش ”عزت“ کا حصول تھی۔ وہ عزت جو اس کی ذات، ماحول، خاندان اور تعلیم اسے دینے سے قاصر تھی۔

شانو نے ایک غریب کسان کے گھر آنکھ کھولی۔ پہلی اولاد لڑکی اور پھر مزید تین لڑکیوں کی پیدائش اس کا جرم ٹھہرا۔ چار لڑکیوں کے بعد لڑکا ہوا لیکن وہ بھی معذور۔ شانو کی ماں وڈیرے کے یہاں روٹیاں پکانے پر مامور تھی۔ پر جب سے اسے کھانسی کے دورے پڑنے لگے تھے، اسے ملازمت سے فوری طور پر برخاست کر دیا گیا تھا۔ چار پیسے جو گھر میں آجاتے تھے وہ تو گئے ہی، بچا کچھا جو کچھ حویلی سے کھانے کو مل جاتا تھا اس کا آسرا بھی گیا باپ کی چرس پینے کی عادت نے ان کے دکھوں میں مزید اضافہ کر دیا تھا۔ بیمار بیوی، چار لڑکیوں کا بوجھ اور معذور لڑکا۔ ان غموں سے نجات اس کو چرس پینے ہی میں ملی۔

شانو شروع ہی سے حساس طبیعت کی مالک تھی۔ گھر کے حالات دیکھ دیکھ کر وہ کڑھتی رہتی۔ اس کے ننھے سے دل نے کبھی اچھے گھر، اچھا لباس یا اچھی خوراک کی تمنا نہ کی تھی۔ بس اس کی ایک ہی آرزو تھی کہ

ساری رات ماں کا کھانس کھانس کر برا حال ہو گیا تھا۔ صبح وہ حکیم صاحب سے دوائی لینے گئی۔ مطب پر کافی رش تھا۔ پہلے پہنچنے کے باوجود حکیم صاحب نے سب سے آخر میں کچھ پڑیاں پکڑا کر احسان کیا کیونکہ اس کے بدلے پیسے تو ملنے نہ تھے۔ تھکے قدموں سے گھر واپسی پر اس نے دیکھا کہ کھیتوں پر زمیندار کے آدمی کسی بات پر اس کے باپ کی خوب خبر لے رہے ہیں۔ باپ سر جھکائے ان کی جھڑکیاں سنتا رہا۔ گلی کے کٹڑ پر گاؤں کے بچے اس کے معذور بھائی کے گلے میں رسی ڈالے، کسی جانور کی طرح اس کی دُرگت بنا رہے تھے۔ گھر میں چھوٹی بہن ایک ٹونا کھلونا حاصل کرنے کے لئے لڑ جھگڑ رہی تھیں۔ شام کو واپسی پر باپ کے پاس چرس کے لئے پیسے نہ تھے۔ دن بھر کے غصے کا نشانہ اب اس کی بیوی اور بچے تھے۔

ہر روز کی طرح وہ دن بھی بیت گیا۔ شام کو باپ سے ملنے گاؤں کا ساٹھ سالہ بھائی آیا۔ وہ کچھ ہزار کے عوض اپنا رشتہ شانوسے کرانا چاہتا تھا۔ باپ کے ہاتھ میں نوٹ دیکھ کر شانوسے میں رہ گئی۔ جیسا بھی تھا وہ آخر اس کا باپ تھا کیا وہ ایسا کر سکتا تھا؟ وہ ایک جیتی جاگتی انسان تھی کوئی بکاؤ مال تو نہیں۔ ساری رات شانوسے نے کروٹیں بدلتے گزار دی۔ صبح باپ کا رویہ اس سے غیر معمولی اچھا تھا۔ شام کو جب وہ کام سے لوٹا تو اس کے ہاتھ میں کچھ پیکٹ تھے جو اس نے شانو کی طرف بڑھا دیئے۔ اس میں ایک نیا سرخ رنگ کا جوڑا اور چوڑیاں زیور تھے۔ باپ نے اسے دوسرے دن کپڑے پہن کر تیار ہونے کو کہا۔ شانوسے نے احتجاجاً ماں کی طرف دیکھا لیکن اس کی آنکھوں میں بے بس اور لا چاری کے سوا کچھ نہ تھا۔ شانوسے نے اس رات ایک فیصلہ کر لیا۔ ایک بھیا نک فیصلہ! باہر صحن میں کھیتوں کے لئے کیڑے مار ادویات کی بوتلیں رکھی تھیں۔ سب گھر والوں کے سوتے ہی شانوسے نے ایک بوتل اٹھائی اور تھوڑا سا ہچکچاتے ہوئے اسے منہ سے لگا لیا تو روح تو پہلے ہی تڑپ رہی تھی۔ جسم بھی کچھ دیر تڑپ کر ابدی نیند سو گیا۔

ہسپتال کے سرجری روم میں شانو کا بے جان جسم میز پر پڑا تھا۔ پوسٹ مارٹم کی رپورٹ تیار کرتے ہوئے ڈاکٹر غنبر، ڈاکٹر فوزیہ سے بولیں۔ ”لڑکی کے چہرے پر کیسی معصومیت ہے۔“ پھر ایک ٹھنڈی آہ بھر

کر بولیں۔ ”رپورٹ تو تیار ہے، پراتی محنت کے کام کا ہمیں معاوضہ ہی کتنا ملتا ہے۔“ ڈاکٹر فوزیہ نے ہاں میں ہاں ملاتے ہوئے کہا۔ ”آج کل اتنی قلیل تنخواہ میں کہاں گزارہ ہوتا ہے۔“ دونوں ایک دوسرے کو دیکھ کر مسکرائیں اور شانو کے باپ کے پاس پہنچیں جہاں وہ لاش سپرد کئے جانے کے انتظار میں ٹھہل رہا تھا۔ گاؤں میں تدفین کا وقت عصر کا تھا اور اب مغرب ہونے کو تھی۔ ڈاکٹر غنبر نے شانو کے باپ سے پوچھا۔

”لڑکی کا شوہر کہاں ہے؟“

”شوہر! شانو کے باپ نے حیران ہو کر پوچھا۔ ”جی اس کی تو ابھی شادی نہیں ہوئی تھی۔“

”اوہ!“ ڈاکٹر فوزیہ بولیں۔ ”لیکن پوسٹ مارٹم رپورٹ تو کچھ اور ہی بتا رہی ہے۔“

”یہ آپ کیا کہہ رہی ہیں ڈاکٹر صاحبہ..... ہم غریب سہی پر عزت دار لوگ ہیں۔“ شانو کے باپ نے کہا۔

”دیکھو جی معاملہ یہیں رفع دفع ہو سکتا ہے۔ بیس ہزار کا بندوبست کر دو۔ بات کہیں نہیں پھیلے گی۔“ ڈاکٹر فوزیہ نے دھیمے لہجے میں کہا۔

”بیس ہزار! نہیں ڈاکٹر صاحب..... ہم غریبوں کے پاس بس تھوڑی سی عزت ہی تو ہے۔“ شانو کا باپ روتے ہوئے بولا۔

”چلو کم از کم دس ہزار کا کہیں سے بندوبست کرو۔ ورنہ رپورٹ تو آگے جانی ہی ہے۔“ ڈاکٹر غنبر یہ کہتے ہوئے آگے بڑھ گئیں۔

کسی نہ کسی طرح قرضے لے کر شانو کے باپ نے ڈاکٹروں کا منہ تو بند کروا دیا پر اس کا دل اور زبان شانو کو کوسنے اور گالیاں دینے پر بند نہ ہو سکے۔ گھر آ کر بیوی کو یہی کہا کہ اسی ذلیل اولاد کیلئے مغفرت کی دعا بھی نہ کرنا کہ وہ اس قابل بھی نہ تھی۔

وہ شانو جو اپنی مختصر زندگی میں عزت کو ترستی رہی، آج ماں باپ کی نظر میں ایک ”بے عزت“ موت مر چکی تھی۔

☆.....☆.....☆

کانٹوں بھرے گلاب

آج سے تو یہ زخم مندمل ہو سکیں لیکن کسی کی قسمت جاگی اور وہ بن بھی گیا تو اس کی فلائیٹ نے ڈیفنس یا کینٹ میں جالینڈ کیا کہ اب وسن پورہ ان کے شایان شان نہ تھا۔

جیسے لوگ مالدار ہوتے ہی غریب رشتے داروں سے منہ پھیر لیتے ہیں کہ سٹیٹس کا معاملہ ہے۔ وسن پورہ سے جو نکلا پھر واپس نہ آیا۔ نفیسہ اپنے خیالوں میں اتنی محو تھی کہ ارسلان نے اسے کہا خالہ گھر آ گیا ہے اتریں گی نہیں۔

کیا کسی شارٹ کٹ سے آئے ہو..... جلدی آ گئے ہیں۔ شاید اس لئے کہ اب وسن پورہ کی یہ سڑک کسی موٹر وے کا نقشہ پیش کر رہی تھی۔ یا اللہ یہ معجزہ کب ہوا؟ خدا خدا کریں خالہ پورے دو گھنٹے لگ گئے۔ ہر سڑک پر ٹریفک جام تھا۔ بس اب آجائیں۔ انیسہ اس کی بڑی بہن تھی۔ وہ بے قراری سے ٹہل رہی تھی کہ جہاز تو کب آ چکا ہے نہ نہیں ارسلان کہاں رہ گیا۔ جب نیل بھی تو اس کی جان میں جان آئی۔

دونوں بہنیں چھ سال بعد ملی تھیں عجب دھوپ چھاؤں کا منظر تھا رورہی تھیں اور جدائی کا غبار دھلنے سے دل پر منوں رکھا ہو جھبھی ہکا ہو رہا تھا۔

اتنے میں ارسلان کے ابو عنایت علی آ گئے اور بیگم کو مخاطب کر کے بولے ٹریفک سین مکمل ہو گیا ہو تو نفیسہ کو چائے پانی پوچھ لو۔ رونے کیلئے تو بہت دن پڑے ہیں۔

انیسہ صرف گھور کر رہ گئی۔ کچھ نہ بولی۔ نفیسہ سے پوچھا باقی بچے کہاں ہیں۔

تزیلہ کی شادی کردی وہ کوریامیں ہے جہاں اس کا میاں PHD کرنے گیا ہے۔

نفیسہ چھ سال بعد پاکستان آئی تھی۔ سب کچھ بدل گیا تھا۔ لاہور تو کسی ماڈرن یورپی شہر کا نقشہ پیش کر رہا تھا۔ کھلی کھلی سڑکیں انڈر پاس اور سگٹی برج۔ سڑکوں کے کنارے پھول اپنی بہار دکھا رہے تھے۔ وطن آنے کی خوشی کئی گنا بڑھ گئی۔

بلند و بالا عمارتیں۔ صاف صاف۔ شاندار نئے ہسپتال، کلینک، سکول گویا کہ ایک میلہ تھا۔ جو ہر طرف سے آنکھوں کو دعوت نظر دے رہا تھا۔

جب گاڑی شاد باغ کے پل سے گزر کر وسن پورہ کی طرف مڑی تو اسے انقلاب کا یقین آ گیا یہ سڑک تو سا لہا سال بنی..... اور ٹوٹ گئی۔

پہلے نئی سڑک کو گیس کے محکمے والوں نے توڑا کہ یہاں گیس نہیں تھی۔ بڑے بڑے پائپ ڈالنے تھے۔ اس کے بعد پھر وہ منتظر رہی کہ اس آپریشن کے بعد کوئی سرجن آئے اور ادھڑی ہوئی سڑک کے زخم سینے کا اعزازی تیغہ حاصل کرے۔ لیکن یہ خوش کن لمحہ نہ آیا۔

پھر گٹر والے آئے کیونکہ اس کو بھی پوش ایریا بنانا تھا۔ فلش سسٹم آنا تھا۔ پھر تو سال ہی گزر گیا۔ سڑک نے اپنے دل کا دامن ہر طرح کے پائپوں کیلئے پھیلا دیا تھا۔ لیکن بے حس معاشرے نے اس کے ایثار کا یہ صلہ دیا کہ انہی زخموں پر ہر طرح کی ٹریفک ستم شعار محبوب کی طرح ستم ڈھاتی رہی مٹی اڑاتی رہی۔ اس کے زخم نا سور بن گئے لیکن کسی کو اس کے حال پر رحم نہ آیا۔

برسات میں اور بھی برا حال ہوتا۔ ہر ایکشن پر باسیوں کے دل میں ایک آرزو مہک کر سر اٹھاتی کہ میاں کوئی وزیر، مشیر، سفیر یا اہل تنویر

سارے بچے لائق۔ پڑھ گئے۔ بھائی جی کا اچھا خاصا کاروبار ہے۔ آپ نے خود اتنا عرصہ سکول کی ملازمت کی ہے۔ اب ایسا کیا ہو گیا ہے۔

میں نے کہا نا، جھاڑی کے پھول دکھائی دیتے ہیں، کانٹے نوک دار اور چھنے والے ہوتے ہیں۔ نظر نہیں آتے۔

ارسلان بھی آکر بیٹھ گیا۔

اچھا خالہ یہ بتائیں اگر میں پوسٹ گریجویشن کیلئے یو کے آ جاؤں تو کیسا ہے۔ یہ میرا آخری سال ہے۔ میں نے امتحان پاس کر لیا ہے۔

یہ تو بڑی خوشی کی بات ہے۔ میرے پاس رہو گے نا۔ مجھے اور کیا چاہیے۔

ہاں یہ ایک رہ گیا ہے اسے تم بلا لو.....

خالہ سنا ہے وہاں سردی بہت ہوتی ہے۔

ہاں ہے تو لیکن ہم تو عادی ہو گئے ہیں۔ اب نہیں لگتی۔

اور وہاں آپ کی کیا مصروفیات ہیں؟

چلو خالہ کو آج سونے دو۔ سفر کی تکان ہو گی ابھی تین ماہ تک یہاں ہیں۔ باتیں تو ہوتی رہیں گی۔

رات کے کسی پہر نفیسہ کی آنکھ کھل گئی۔ اس نے گھڑی دیکھی۔ صبح ہونے میں ابھی ایک گھنٹہ باقی تھا۔ اس نے وضو کیا اور سوچا کہ نماز شب ادا کرے۔ پھر اذان ہو جائے گی..... نماز کی تو وہ ہمیشہ سے پابند تھی لیکن نوید کے جانے کے بعد عبادت میں اور باقاعدگی آ گئی۔

اسے پتہ چلا کہ خدا کی یاد میں ہی حقیقی سکون ملتا ہے ہم ساری زندگی کس کس دروازے پر اس اطمینان کیلئے دستک دیتے رہے اور یہ بالکل ہمارے ساتھ ہمارے پاس بلکہ ہمارے ہاتھ میں تھا۔ اس نے شکرانے کے نفل ادا کئے کہ خیریت سے سفر کٹ گیا۔ صبح کی نماز کے بعد وہ سیدھی کچن کا رخ کرتی اور اپنے لئے بیٹی بناتی۔ دعا مانگنے کے بعد وہ باہر نکلتی تو اسے بہن کے کمرے سے شور سنا سنائی دیا۔

ذرا آگے بڑھی تو پتہ چلا کہ آپ اور عنایت بھائی کے درمیان زبردست ٹوٹوٹو میں میں کامیابان سجا ہے۔ اس کے قدم وہاں رک گئے۔

راحیلہ پنڈی ہوٹل میں قائد اعظم یونیورسٹی میں ایم بی اے کر رہی ہے۔ ارمغان نے ٹیکنیکل کورس کیا تھا اسے یمن میں جاب مل گئی ہے۔ نبیلہ چھوٹی اپنی سہیلی کے گھر گئی ہے اس کے ہاں کوئی فنکشن تھا۔

ارسلان نے خالہ کا سامان لا کر گیسٹ روم میں رکھا اور کہنے لگا خالہ آپ فریش ہو جائیں۔ میں چائے بناتا ہوں۔

تم رہنے دو۔ میں خود بنالوں گی۔ تم نے کچن کب سے سنبھال لیا؟

جب تک ایم بی بی ایس کی ڈگری نہیں مل جاتی۔ یہ ہاؤس جاب تو کرنا پڑے گا۔

نفیسہ کے اولاد نہ تھی۔ چھ سال قبل شوہر بھی داغ مفارقت دے گئے۔ اس نے شوہر کے جیتے جیتے قاسم کو گود لیا تھا۔ اس کی شادی کر دی اور وہ بیوی کو لے کر امریکہ شفٹ ہو گیا۔ اس نے کئی بار کہا کہ امی وہاں آ جاؤ لیکن نفیسہ کو یو کے میں رہتے ہوئے 25 سال ہو گئے تھے۔ وہ امریکہ گئی ضرور..... لیکن وہاں کا ماحول اسے نہ آیا۔

یو کے میں وہ دل بہلانے کیلئے جاب کر لیتی۔ ایک تنظیم جو مسلم خواتین کیلئے کام کرتی تھی وہ جوائن کر لی۔ پھر بہت ساری دوست تھیں۔ انیسہ نے بہت بلایا کہ تم وہاں اکیلی ہو۔ ادھر آ جاؤ۔ لیکن اس گھر کے ساتھ اس کے شوہر احمد نوید کی یادیں تھیں۔ ان کے ہاتھوں کے لگائے ہوئے پودے تھے۔ بس اسے وہاں رہنا آسان لگتا تھا۔ پھر پاکستان کی خبریں سن کر اس کا دل ویسے ہی ڈر جاتا۔ اب بھی پتہ نہیں اس ٹرپ کیلئے اس نے کیسے حوصلہ کر لیا۔

آپا..... آپ کی صحت کیسی ہے۔ کھانے کے بعد دونوں بہنوں نے ایک دوسرے کا حال چال دریافت کیا۔

بس نفیسہ..... زندگی ہے یا کانٹوں بھری گلاب کی جھاڑی ہے۔ لوگوں کو تو پھول نظر آتے ہیں۔ لیکن جھاڑی کے کانٹے آپ کو لیرو لیرو کر دیتے ہیں۔ پور پور زخمی..... لہو لہان..... لیکن جینا تو پڑتا ہے۔

آپا ایسا کیا ہو گیا ہے آپ تو بہت ہی مایوس ہیں ماشاء اللہ آپ کے پاس اللہ کا دیا سب کچھ ہے پھر اولاد اس کی سب سے بڑی نعمت

انیسہ تمہارے منہ سے انصاف کا لفظ بہت عجیب لگتا ہے۔
نفیسہ تو جیسے پتھر کی ہو گئی تھی۔ اف خدا! مجھے تین ماہ یہاں
گزارنے ہیں۔ وہ جلدی سے کچن کی طرف بڑھ گئی۔ تو یہ تھے جھاڑی
کے گلاب..... وہ سوچتی رہی لیکن فیصلہ نہ کر سکی کہ قصور کس کا ہے۔
وہ ٹی بیگ ڈھونڈ رہی تھی۔ پانی ابل گیا تھا کہ عنایت بھائی
اچانک کچن میں آ گئے۔

وہ بولی بھائی صاحب مجھے صبح چائے پینے کی عادت ہے۔
آپ کیلئے بھی بنا دو؟ انہوں نے سر ہلایا اور واپس چلے گئے۔
اس نے تینوں کیلئے چائے دم کی اور ٹرے میں رکھ کر ڈائننگ
روم کی ٹیبل پر رکھ دی پھر انیسہ سے جا کر کہا۔
آپا چائے بن گئی ہے۔ یہاں لے آؤں یا آپ باہر آئیں
گی۔

ہائے تم نے کیوں تکلیف کی۔ دودن تو مہمان نوازی کرنے
دیتیں۔
میرا اپنا گھر ہے۔ آپا تکلف کی کوئی بات نہیں۔
اس نے چائے بنا کر انیسہ کو دی اور دوسری پیالی بنا کر پوچھنے
لگی۔ بھائی صاحب سو رہے ہیں؟ وہ نہیں چاہتی تھی کہ انہیں علم ہو کہ
اس نے ان کی صبح تو تکار سن لی ہے خواہ مخواہ شرمندہ ہوں گے۔
اتنے میں عنایت صاحب خود ہی آ گئے۔

بظاہر دونوں لائق اور خاموش تھے۔ لیکن نفیسہ اندازہ لگا رہی
تھی کہ اندر ہی اندر دونوں ابل رہے ہیں اور جب پریشور بڑھے گا
تو.....
اس نے دل میں سوچا جہاں دو برتن ہوتے ہیں کھڑک ہی
جاتے ہیں تم ایسے ہی وہم کر رہی ہو۔

نفیسہ تم پاکستان ہی آ جاؤ۔ وہاں اکیلی رہ کر بور نہیں ہوتی۔
عنایت بھائی کہنے لگے۔ جواباً
اس کی بجائے انیسہ بولی۔
دل جلانے والی کمپنی سے تو بندہ اکیلا ہی اچھا ہے۔

تم کو نسا سات پانیوں سے دھلے ہوئے ہو۔ جو کچھ کمایا ساری عمر
اپنے رشتے داروں پر لٹایا۔ میں نے نوکری کر کے اپنے بچوں کو پالا اور
پڑھایا، وہ چلائی۔ نفیسہ بیگم صبح میرا منہ نہ کھلواؤ میں نے ہمیشہ ہر
ضرورت کا خیال رکھا ہے اور تمہیں کھلا خرچہ دیا ہے لیکن تم جیسی ناشکری
عورت اس روئے زمین کوئی اور نہ ہوگی۔

تمہاری اس جھج جھج کی وجہ سے سارے بچے گھر سے دور بھاگتے
ہیں۔ آج ارسلان بھی خالہ سے کہہ رہا تھا کہ فائل کے بعد یو کے چلا
جائے گا، وہ بولے۔ تمہارے کلیجے میں تو ٹھنڈ پڑ جائے گی ظالم انسان
پہلے تو نے میری زندگی برباد کی اور پھر میرے بچوں کو کھا گیا۔ ہائے
میرے نصیب..... کہاں جاؤں؟
میں نے تو خود تمہیں ساری عمر ایک عذاب کی طرح بھگتا ہے۔
جانے کن ناکردہ گناہوں کی سزا ملی ہے۔

تو چھوڑ دینا تھا۔ میں نے کب کہا تھا کہ میں تم سے جدا ہو کر مر
جاؤں گی۔ مگر کیا کرتی آدھا درجن بچے..... ان کا کیا سیوا کرتی۔
میرے جانے کے بعد تم نے ان کا کیا حشر کرنا تھا۔ تم انسان نہیں ایک
وحشی جانور ہو۔ ماں تو ماں ہوتی ہے.....

تو پھر اپنی مرضی سے زندگی گزاری ہے تو اب شکوہ کیا.....
تم سے کیا کہوں۔ اپنے مقدر سے شکایت ہے۔ میری تعلیم، سلیقہ
حسن، جوانی سب تو نے مٹی میں رول دیا۔

بندر کیکواس..... میرا دماغ خراب کر کے رکھ دیا ہے، میں کمرے
سے باہر نکل جاتا ہوں۔ عنایت اٹھ کر باہر چلے گئے۔
جاؤ..... جاؤ دفعہ ہو جاؤ۔ تم نے یہ کھڑاگ تو کھڑا کرنا تھا میری
بہن مہمان جو آئی ہے اس کے سامنے مجھے جب تک ذلیل نہ کر لو۔ تمہیں
کہاں چین آتا ہے۔

اگر اپنی عزت کا اتنا ہی خیال ہے تو جب تک نفیسہ یہاں ہے اپنی
زبان بند رکھو.....

ہاں میں زبان پر تالے ڈال دوں۔ لیکن تم اٹھتے بیٹھتے خنجر چلاتے
رہو اچھا انصاف ہے۔

میں وہاں سیٹ ہوں پھر یہاں کے حالات سے ڈر لگ جاتا ہے۔

آخر ہم بھی تورہ رہے ہیں اور اٹھارہ کروڑ لوگ اور بھی.....
اچھا ابھی تو میں آئی ہوں سوچوں گی۔ اس دفعہ کا قیام کیسا رہتا ہے۔

بہت اچھا رہے گا..... ارسلان تیار ہو کر ٹیبل پر آگیا تھا۔ ابھی تو میں نے بوکے پڑھنے کیلئے آتا ہے۔ آپ یہاں نہیں آئیں گی۔
اچھا برخوردار..... تم بھی اڑ چھو ہونے کے چکر میں ہو تم نے بتایا بھی نہیں۔

ابو..... آج کل باہر کی ڈگری کے بغیر تو مقام بنانا بہت مشکل ہے۔ میں نیوروجن بننا چاہتا ہوں۔

ویری گڈ..... یہ بہت اہم فیملڈ ہے۔ تمہیں گھر میں ہی کئی مریض مل جائیں گے۔ انیسہ بیٹے کیلئے ناشتہ بنانے چلی گئی تھی اس نے یہ طنز یہ فقرہ نہ سنار نہ جوابی گولہ باری کا پورا امکان تھا۔
وہ ناشتہ کرتے ہوئے بولا۔

خالہ شام کو تیار رہیے گا۔ آپ کو لاہور کی سیر کرانی ہے دیکھیں کتنا بدل گیا ہے۔

ہاں وہ تو میں نے ون پورہ کی مین روڈ سے ہی اندازہ لگا لیا ہے۔
اچھا امی ابو خالہ مجھے دیر ہو رہی ہے۔ خدا حافظ شام کو ملاقات ہوگی۔
سنو سنو مجھے ذرا مار کیٹ تک اتار دو تھوڑا سا سودا لانا ہے۔

امی اتنی صبح تو دکا نین نہیں کھلی ہوں گی۔ ابو لے جائیں گے۔ بلکہ ان کو فہرست دے دیں وہ لے آئیں گے۔

بالکل بالکل..... بیگم صاحبہ غلام حاضر ہے تم جاؤ بیٹے دیر ہو رہی ہے۔ عنایت نے جواب دیا۔

انیسہ نے انڈے تل کر ٹوسٹ گرم کر کے ٹیبل پر رکھے اور تازہ چائے دوبارہ دم کی۔

مجھے فہرست بنا دو۔ میں سودا لے آؤں۔ صبح گوشت اور سبزی اچھی مل جاتی ہے۔ انہوں نے انیسہ کو مخاطب کیا۔

مجھے چائے پینے کی اجازت ہے یا یہ نادر شاہی حکم پہلے پورا کروں؟

اس کا لہجہ بہت ہی کرخت اور خوفناک تھا۔ نفیسہ دل ہی دل میں پشیمان ہو رہی تھی کہ یہ میں کہاں آگئی ہوں، اس ساتھ سے تو بندہ اکیلا ہی اچھا ہے۔

تھوڑی دیر بعد اس نے ٹوکری اور فہرست لا کر دیدی عنایت علی نے چائے ختم کی اور بولے۔

نفیسہ تمہیں کھانے میں کیا پسند ہے بولو کوئی خاص چیز لاؤں۔
آئس کریم کھاؤ گی۔

نہیں بھائی جی..... وزن بڑھانے کا کوئی ارادہ نہیں۔ میں تو بہت سادہ غذا کھاتی ہوں۔ کوکلیسٹرول پہلے ہی زیادہ ہے۔

یہ سب ڈاکٹروں کی زیادتی ہے وہ مریضوں کو ڈرا ڈرا کر ان کا جینا حرام کر دیتے ہیں۔

جو کچھ لانا ہے میں نے لکھ دیا ہے جائیں اب دیر نہیں ہو رہی؟ وہ چیپ کر کے چل دیئے۔

نفیسہ فوراً ہی اٹھ گئی اور کپڑے نکال کر استری کرنے لگی۔ آپا راحیلہ ویک اینڈ پر گھر آتی ہے؟ اس نے پوچھا۔

نہیں..... چھ ماہ بعد کہیں چکر لگاتی ہے۔ ساتھ جاب بھی کر رہی ہے۔ وقت نہیں ہوتا اس کے پاس..... اب میں سوچ رہی ہوں کہ اس کی شادی کر دوں مگر کیا کروں پلہ نہیں پکڑاتی.....

کیوں شادی کرنے کا ارادہ نہیں ہے؟ لڑکیاں ایسے ہی کرتی ہیں، لیکن کوئی اچھا رشتہ آیا تو مان جائے گی۔ اسے فون کریں ناں کہ اس ویک اینڈ پر ضرور آئے۔ میں اسے سمجھاؤں گی۔ ہے کوئی لڑکا نظر میں.....؟

انیسہ نے کوئی جواب نہ دیا۔

نبیلہ کب آئے گی؟ میں نے اسے چھوٹا سا دیکھا تھا.....

اب تو خیر سے ایف ایس سی کر رہی ہے۔

کیوں اس کا بھی ارادہ میڈیکل میں جانے کا ہے۔

نا بابا..... میں نے تو ایک کو بڑی مشکل سے پڑھایا ہے پھوپھی
نے اس کا ہاتھ مانگ رکھا ہے خود ہی پڑھائے گی نہ جانے داخلہ ملتا ہے یا
نہیں۔

اچھا آپا میں نہانے جا رہی ہوں۔

کوٹھ مغز..... ہی رہے۔ عقل نہیں آئی یہ کہہ رہی ہوں۔ یہ
بھنڈیاں بھی باسی ہیں اگر تازہ نہیں تھیں تو نہ لاتے اور میں نے کیک
منگوایا تھا۔ شام کی چائے کیلئے..... وہ کہاں ہے۔

وہ بیکری والے نے کہا ہے کہ ابھی تازہ کیک بن کر آئیں گے
میں دو بجے آکر لے جاؤں۔

اب تعریف نہ کرنا۔ موت نظر آتی ہے۔ دیکھو انیسہ میں لحاظ کر رہا
ہوں۔ اگر تم نے یونہی گولہ باری جاری رکھی تو میرا حوصلہ جواب دے
جائے گا۔ میں نہیں جانتا کہ نفیسہ کو ہماری تو تکار کا پتہ چلے وہ کیا سوچے گی
ہمارے بارے میں۔

بولو..... میاں بولو اور اپنی اصلیت دکھاؤ۔ اسے بھی پتہ چلے کہ
میں نے زندگی کس جہنم میں گزاری ہے کوئی عذاب سا عذاب ہے۔ میں
کہتا ہوں میرا منہ نہ کھلو۔ آئندہ خود جا کر سودا لے آیا کرنا میں نہیں
لاؤں گا۔ تم نے میرے ہر کام میں کیڑے ضرور نکالنے ہوتے ہیں۔
ہاں، نکلے گھر میں روٹیاں توڑتے ہو۔ یہی تو ایک کام تھا جو
تمہارے کرنے کا ہے اب اس سے بھی ہاتھ اٹھاؤ۔

جوان اولاد کے سامنے جب تم یہ بے ہودہ زبان استعمال کرتی ہو
تو تمہیں شرم نہیں آتی۔ تمہارے بال بھی سفید ہو گئے ہیں۔ جس طرح تم
اپنے مجازی خدا کے ساتھ سلوک کرتی ہو تمہاری بیٹیاں بھی یہی سیکھیں
گی۔ تو کیا خاک اپنے گھر بسائیں گی۔

اے لوجی۔ تمہارے منہ میں خاک..... میری بیٹیوں کو بد دعا
دے رہا ہے۔

عجیب بد دماغ عورت ہو۔ کیا وہ میری اولاد نہیں ہے۔ تم میکے
سے لے کر آئی تھیں۔ میں تو تربیت کے حوالے سے بات کر رہا تھا۔
لیکن تم پر جو تمہاری عقل گھاس چرنے لگی ہے۔

تم تو مجھے پاگل کر دو گی۔

کیا ابھی کوئی کسر باقی ہے۔ پاگل کے ساتھ ہی تو گزارا کر رہی
ہوں

تو بکواس کرتی رہ..... میں آفس جا رہا ہوں۔

نفیسہ اندر اپنا سامان کھول کر جو تختے ان کیلئے لائی تھی وہ نکال رہی
تھی اور سوچ رہی تھی کہ یہ دونوں کتنے مضبوط اعصاب کے مالک
ہیں..... بھلا یہ کوئی زندگی ہے۔ کیسے جی رہے ہیں۔

یہ میری بہن..... تو نہیں لگتی.....

عزت و احترام..... تو جیسے یہاں ہے ہی نہیں..... کیا میں آپا کو
سمجھاؤں؟

میں بھلا اپنا سکون اطمینان اور تنہائی چھوڑ کر کیوں آئی.....؟
لگتا ہے چوراہے میں آ بیٹھی ہوں۔

اتنے میں فون کی گھنٹی بجی۔ انیسہ نے فون اٹھایا۔

ارے راحیلہ کیسی ہو..... کب آرہی ہو؟ تمہاری خالہ آگئی ہیں۔ تم
چھٹیاں لے کر آ جاؤ..... اچھا میں بات کراتی ہوں۔

نفیسہ یہ لو..... راحیلہ کا فون آ گیا ہے۔

ہیلو..... السلام علیکم کیسی ہو۔ کب آرہی ہو.....

خالہ آپ اسلام آباد آ جائیں۔ خوبصورت شہر ہے موسم بھی بہت
اچھا ہے۔ آپ کو خوب سیر کراؤں گی۔

تم آؤ گی تو سب سے مل لو گی۔

مجھے گھر نہیں آنا..... وہ گھر نہیں ہے چڑیا گھر ہے جب دیکھو
لڑائی.....

اچھا میری خاطر آ جاؤ۔ نفیسہ نے پیار سے کہا۔

خالہ میں نے بہت دل کو جلایا ہے۔ اب نہیں۔

میں تو نبیلہ کو بھی اپنے پاس لے آؤں گی۔ پھر لڑتے رہیں دونوں

اچھا..... پھر میں تمہاری امی سے بات کروں گی۔

ضرور آئیے گا..... اللہ حافظ

کیا کہہ رہی تھی؟

ہوگئی۔

تو وہ میری عزت کیوں نہیں کرتا۔ ایسہ نے ترکی بہ ترکی جواب دیا۔
آپ عزت کروائی جاتی ہے۔
کیسے..... تم بہت پڑھ لکھ گئی ہو ولایت پاس کر کے آئی ہو۔ ذرا
بتاؤ مجھے۔ اس نے سوال کیا۔

صبر سے خاموشی سے۔ خدمت سے اور عزت کر کے ہم دوسرے
کی عزت نہ کریں اور اس سے توقع رکھیں یہ کیسے ممکن ہے گھر کا سکون
عورت کے ہاتھوں میں ہوتا ہے۔

نہ بی بی..... ولایت کے اصول یہاں لاگو نہیں ہوتے ہیں یہاں
تو مرد ہی کو سمجھاتے ہیں یہ بوکے میں ہوتا ہوگا۔ یہاں تو میں نے نہیں
سنا۔ شام کو ارسلان آئے گا تو میں اس سے بات کرتی ہوں۔
کھانے کی ٹیبل سے اٹھتے ہوئے نفیسہ نے ارسلان سے کہا کہ
میرے کمرے میں آنا مجھے تم سے کچھ بات کرنی ہے۔ وہ فوراً چلا آیا۔
جی خالہ فرمائیں۔ کیا بات ہے۔

یہ تمہارے امی اور ابا کے درمیان کیا مسئلہ ہے۔ تم خود میڈیکل
پروفیشن میں ہو تو کسی سائیکا لو جسٹ سے ٹائم لے دو۔ انہیں دکھا دو۔
اوہ..... تو آپ کو بھی پتہ چل گیا..... کیا امی شادی سے پہلے بھی
ایسی غصے والی تھیں۔

ہاں ذرا مزاج کی تیز تھیں۔ لیکن یہ حال تو ہرگز نہیں تھا۔
میں تو یہاں آکر پشیمان ہوں تم میری سیٹ جلدی کروادو میں
یہاں رہی تو پاگل ہو جاؤں گی۔

خالہ سوچیں..... ہم کیسے جی رہے ہیں۔ آپ تین ماہ بھی رکنا
نہیں چاہتیں..... میری خاطر رک جائیں۔ اتنی جلدی فیصلہ نہ کریں۔
میرا خیال تھا کہ آپ کے آنے کا اچھا اثر پڑے گا اور حالات بدل جائیں
گے۔

نفیسہ بولی..... اچھا پہلے ان کو ڈاکٹر کو دکھاؤ۔

وہ تو جانے کو تیار نہیں ہوں گی کہتی ہیں میں سائیکا ٹرسٹ کو کیوں
دکھاؤں میں کوئی پاگل ہوں۔

وہ تو مجھے بلارہی ہے کہ اسی بہانے آپ اسلام آباد کی سیر بھی کر
لیں گی ہاں اسے تو اس گھر سے نفرت ہے۔ پالا پوسا پڑھایا لکھایا.....
اب ہم برے ہو گئے۔ چار پیسے کمانے کے قابل ہو گئی۔ ہمیں کیوں منہ
لگائے گی۔ نفیسہ سے صبر نہ ہو سکا۔

آپا..... آپ کے ساتھ مسئلہ کیا ہے۔ اتنی ہانپہ کیوں ہو جاتی ہیں۔
لو تم بھی شروع ہو جاؤ۔ مجھ کو الزام دیتے ہیں۔ عنایت علی جیسے خر
دماغ کے ساتھ زندگی گزارنا کسی جہاد سے کم نہیں ہے۔

یہ تو سچ ہے پھر تو آپ غازی ہوئیں۔ لیکن کسی کو بلکہ اپنی اولاد کو تو
بخش دیں۔

تمہیں کچھ معلوم نہیں ہے کہ میں نے کیا کیا برداشت کیا ہے اب
مجھ میں حوصلہ نہیں ہے کسی کی بات نہیں سن سکتی۔ غصہ آ جاتا ہے۔
بلڈ پریشر بڑھ جاتا ہے۔ پٹھے کھینچ جاتے ہیں۔ راتوں کو نیند نہیں آتی۔
پاؤں کے تلوے درد کرتے ہیں ایک بیماری ہو تو بتاؤں لیکن ہاں کسی کو
احساس ہی نہیں۔

آپا ادھر آئیں اطمینان سے بیٹھیں۔ آگ کا علاج آگ سے تو
نہیں کیا جاتا۔ آگ پر پانی ڈالا جاتا ہے۔

صبر سے۔ نرمی سے۔ اچھے الفاظ کے چناؤ سے۔ دوسرے کو
معاف کر کے بیٹو.....

یہ سب صرف الفاظ ہیں۔ نوید تو مٹی کا مادہ تھا۔ اس نے تو خوب
عیش کرائے۔ بچہ کوئی تھا نہیں۔ تم کیا جانو کہ آگ پہ چلنا کسے کہتے ہیں۔
پرانی آگ کی کیا خبر۔

آپ نوید کو درمیان میں کیوں گھسیٹ رہی ہیں۔ میں تو آپ کو
سمجھانا چاہ رہی تھی۔ اپنے گھر کا سکون برقرار رکھنے کیلئے کسی ایک کو تو
کمپر و مائز کرنا پڑے گا۔

لیکن میں ہی سمجھوتہ کیوں کروں۔ عنایت علی کیوں نہ زبان کو لگام
دے۔

آپا آپ تو بھائی صاحب کا ذکر ایسے کرتی ہیں جیسے وہ کوئی نوکر
ہے اب تو وہ گھر میں نہیں ہیں۔ ان کی عزت تو کیا کریں۔ نفیسہ ذرا تیز

مجھے امید ہے میں منالوں گی تم ٹائم لے لو۔

میں نے تو بس دو تین گھنٹے کیلئے آفس جانا ہوتا ہے۔ مجھے کھانا بنانا آتا ہے۔ ایک مائی کا انتظام کر لیں گے۔

اسی نے فون ملایا اور اپنے پروفیسر سے بات کی۔ انہوں نے کہا۔ کل ہی لے آؤ۔

آج بہت دنوں بعد انیسہ باہر دھوپ میں آکر بیٹھی اور بس رہی تھی۔ ارسلان نے کہا۔ ہم تو آپ کی مسکراہٹ کو ترس گئے تھے۔ چلیں آج رات باہر کھانا کھانے چلتے ہیں۔ کینٹ میں ایک انالین ریستورنٹ کھلا ہے..... آپ اب کیسا محسوس کر رہی ہیں۔

نفیسہ اور ارسلان باہر بیٹھے رہے۔ ڈاکٹر نے سب کو باری باری بلایا۔ اور تشخیص کی کہ وہ شیڈول فریڈی کی مریضہ ہیں۔ فکر والی کوئی بات نہیں۔ چھ ماہ دوائی کھائیں مکمل صحت یابی تو نہیں ہوگی۔ البتہ علامات میں کمی ہو جائے گی۔

ہاں..... مجھے سمجھ نہیں آرہی کہ میں آپ سب کا شکریہ کیسے ادا کروں سب نے مجھے بہت برداشت کیا ہے میں شک کرتی تھی اور خوفزدہ رہتی تھی نہ جانے مجھے کیا ہو گیا تھا۔

دوائی شروع ہو گئی۔ پہلے کم خوراک سے شروع کیا۔ نیند والی دوائی بھی تھی۔ اب وہ زیادہ وقت سوئی رہتی۔ کچن کا سارا کام نفیسہ نے سنبھال لیا۔ اس نے راحیلہ کو صورتحال سے آگاہ کیا وہ بھی آگئی۔ عنایت علی کہنے لگے۔

یہ تو بیماری کی ایک کیفیت تھی۔ اس میں آپ کا کیا قصور ہے۔ ہم نے میڈیسن میں پڑھا ہے کہ مریض شک کرتا ہے اور بے بنیاد خوف میں مبتلا رہتا ہے کہ کچھ ہو جائے گا اس کی عادتیں بدل جاتی ہیں پوری شخصیت دو حصوں میں تقسیم ہو جاتی ہے اس کے ارد گرد کے لوگوں کو سمجھ نہیں آتی وہ الٹا اس کو لعن طعن کرتے ہیں۔ مگر علاج کیلئے ڈاکٹر کی طرف رجوع نہیں کرتے۔ حالانکہ پہلی سٹیج میں اس کا علاج ممکن ہے اور مریض پوری طرح صحت یاب ہو کر نارمل زندگی گزارتا ہے۔ لوگ یا تو پیروں فقیروں اور عالموں کے پاس پھرتے رہتے ہیں یا علاج ہی نہیں کرواتے۔ مریض کے ساتھ ساتھ پورے خاندان کی زندگی تلخ و ترش ہو جاتی ہے۔ ارسلان نے پورا لیکچر دہرا دیا۔

نفیسہ میں تمہارا شکریہ کیسے ادا کروں تمہارے آنے سے ہمارا ٹوٹا ہوا گھر، بکھرے ہوئے بچے اور زخمی دل..... دوبارہ زندہ ہو گئے ہیں۔ میں نے تو کئی بار امی سے کہا تھا کہ سائیکالوجسٹ کو دکھا دیں وہ مانتی نہیں تھیں پتہ نہیں خالہ نے کیسے منالیا، انہی کا حوصلہ ہے۔

اگر تم یہ سب جانتے تھے تو اپنی امی کا علاج کیوں نہ کروایا نفیسہ نے پوچھا۔

نفیسہ بولی، بھائی صاحب آپ بھی وعدہ کریں کہ صبر سے کام لیں گے۔ اتنی زندگی تو گزر گئی۔ تھوڑی سی رہ گئی ہے بس یہ سکون سے گزار دیں۔

میرا وعدہ..... اصل میں طعنہ اور طنز انسان سے برداشت نہیں ہوتا۔ میں نے اتنا کچھ سنا ہے کہ ایک اچھی خاصی ڈکشنری تیار ہو سکتی ہے۔

ابا آپ اب پرانی باتیں یاد نہ کریں۔ اس نے بہن سے پوچھا۔ کہ تم کب گھر واپس آرہی ہو۔

خالہ میں نے جب بھی کہا تو امی نے مجھے بھی بے نقط سنا ڈالیں کہ میں پاگل ہوں جو دماغی امراض کے ماہر کو دکھاتی پھروں۔ میں کیا کرتا، وہ کسی کی بھی نہیں سنتی تھیں آپ تو ہمارے سارے خاندان کیلئے فرشتہ رحمت بن کر آئی ہیں۔ ہم سارے آپ کے شکر گزار ہیں۔ اس لئے تو آپ کو ڈنر پر لے کر جا رہے ہیں۔

اس نے کہا میری اتنی اچھی جاب ہے۔ میں ٹرانسفر کیلئے اپلائی کروں گی۔

میرا تو بس ایک ماہ رہ گیا ہے۔ جب تک آپ مکمل صحت یاب نہیں ہو جاتیں تو گھر کا انتظام تمہیں کو کرنا ہوگا۔ نفیسہ تم فکر نہ کرو۔

نہ جی اتنے بڑے کام کا یہ ذرا ساناعام مجھے نہیں چاہیے صرف ڈنر

پڑھا رہے ہو۔ نفیسہ نے شرارت سے کہا۔

میں صدقے جاؤں اپنی خالہ کے..... آپ حکم کریں ہماری جان بھی حاضر ہے۔ یہ راحیلہ تھی۔

سلامت رہو میری بچی..... مجھے تمہاری جان نہیں محبت چاہیے میرے لئے یہی کافی ہے۔

پھر بھی تم فرمائش تو کرونا..... یہ عنایت بھائی تھے۔

میری خوشی اس میں ہے کہ آپ سب میرے ساتھ یو کے چلیں۔ سیر کریں اور تین ماہ ہم خوب مزے کریں گے۔

یہ تو بہت اچھی بات ہے یہ تو ہمارا انعام ہے ہم ضرور جائیں گے۔

میرا ووٹ حاضر ہے۔ یہ نبیلہ تھی۔ واقعی مہمان خدا کی رحمت ہوتا ہے مجھے یقین آ گیا ہے۔

ورنہ..... ورنہ یہ گھر ویران قبرستان لگتا تھا۔ ارسلان نے کہا۔

چلو سب نماز پڑھو اور دو نفل شکرانے کے ادا کرو ابو یو کے جانا پکا ہے ناپہلے وعدہ کریں نبیلہ نے باپ سے کہا۔ انشاء اللہ بالکل پکا ہے۔

6 ہفتے دوائی استعمال کرنے کے بعد دوبارہ ڈاکٹر کو دکھانا تھا۔ وہ اپنی مریضہ کی اتنی اچھی پراگرس دیکھ کر بہت خوش ہوئے اور دوائی کی خوراک کم کر دی اور بتایا کہ ان کو تنہا نہ چھوڑیں خوش رکھیں۔ روزانہ سیر کریں۔ انہیں تحفظ کا احساس دیں۔

انیسہ کو یقین تھا کہ یہ میری بہن رحمت بن کر آئی۔ میرے لئے دعا بھی کی اور مجھے علاج کروانے کا مشورہ بھی دیا۔

جب سے علاج شروع ہوا انیسہ کے کمرے میں نفیسہ سو جاتی تھی۔ ایک رات آنکھ کھلی تو نفیسہ جائے نماز پر سجدہ ریز تھی اور دعا گو تھی۔

اے میرے رب تو اپنے احسان سے راہ راست دکھانے والا ہے تو معافی دینے پر قادر ہے اور رحم کے بلند ترین مقام پر فائز ہے۔

میرے رب تو نے مجھ پر کرم کیا۔ میری تکلیف کو مجھ سے دور

فرمایا اور مجھے شفاء عطا کی۔ میں نے اپنی بیماری، ذہنی خلجان اور نادانی سے کتنے عرصے تک سب کا دل دکھایا۔ خاص طور پر اپنے مجازی خدا کو تنگ کیا۔ ان سے زبان درازی کی۔ زبان طعن و طنز درازی میں اپنے اس برے عمل پر نادم اور شرمندہ ہوں۔ مجھے معاف کر دیں میں وعدہ کرتی ہوں اے میرے پروردگار میں پھر کسی کا دل نہ دکھاؤں گی۔ جنہوں نے مجھے برداشت کیا۔ صبر کیا۔ میری خدمت کی اور میرا علاج کرایا۔ ان کو اجر عظیم عطا فرما۔ ان کے درجات بلند فرما۔ مجھے صحت، طاقت اور توفیق دے کہ میں ان سب کی خدمت کر کے اپنے برے عمل کو اچھے عمل میں بدل لوں میرے رب تیری توفیق کے بغیر میں یہ نہیں کر سکتی۔ تو جو دلوں کے بھید جانتا ہے اور تیری قدرت زبردست ہے تو بدیع العجائب ہے میرے لئے خیر کے عجائبات پیدا فرما۔ ہمیں ایمان عطا فرما اور اپنی نافرمانی سے بچا۔ جب ہم دنیا سے جائیں تو کلمہ اور ایمان ساتھ لے جائیں۔ میں تیری گناہگار، مسکین، عاجز اور ذلیل بندی ہوں میرے آنسو قبول فرما اور اس دعا کو قبول فرما لے۔

نفیسہ کی آنکھوں میں شکرگزاری کے آنسو آ گئے۔

☆.....☆.....☆

ماسی بے برکتے

شام دیر گئے تک چائے دیگر لوازمات کے ساتھ نوش جان کرتے جاتے اور ساتھ ہی ساتھ خوب مزے مزے کی باتیں بھی ہوتی رہتیں۔ اس اتوار یہ رسم باری کے لحاظ سے مجید کرمانی کے گھر پر ادا ہوئی تھی۔

ماسی برکتے کو اس دعوت کی تیاری ہر چوتھے ماہ باقاعدگی کے ساتھ کرنا ہوتی تھی جس کے لیے باقاعدہ چھ سات اقسام کے اعلیٰ و مرغین کھانے اور تین چار اقسام کی شیرینیوں کی تیاری تو ایک لازمی امر تھا۔ گزشتہ سولہ سال سے وہ چار ماہ میں ایک بار ہونے والی دعوت کے انتظامات کرتے کرتے اس قدر مشاق ہو چکی تھی کہ اسے مہر النساء سے محض ایک اشارہ ملنے کی دیر ہوتی اور دو تین روز پہلے ہی سے دعوت کے کھانوں میں ڈلنے والے مصالحات کی تیاریاں شروع کر دیتی۔ ایک روز قبل ہی گوشت، مرغی، مچھلی اور کبابوں وغیرہ کے قیمے کو مصالحہ لگا کر رکھ چھوڑتی اور پھر دعوت والے روز علی الصبح ہی سے جو بارہا چرچا خانے میں داخل ہوتی تو پھر مہمانوں کو کھانے کی میز پر بلانے سے چند لمحات پہلے تک اس کے پاؤں وہاں سے بمشکل ہی باہر نکلتے۔

ماسی برکتے مجید کرمانی کے پاس اس وقت سے کل وقتی طور پر کام کرتی چلی آ رہی تھی جب وہ ایک بڑے افسر کی حیثیت سے کسی اہم سرکاری ادارے میں متعین تھا۔ اب وہ کون سے عہدے اور کس ادارے میں تھا، یہ تو ماسی برکتے کو آج جب کہ وہ چار پانچ برس ہوئے ریٹائر ہو چکا تھا، تب بھی معلوم نہ ہو سکا اور پھر ہوتا بھی کیسے۔ ماسی برکتے ٹھہری ملکنی طبیعت کی عورت۔ ہر وقت کام میں یا پھر خود میں گم۔ صبح سویرے ہی وہ اپنا چوہا چوکی جو سنبھالتی تو پھر ناشتے سے لے کر رات کے کھانے تک کی جملہ ذمہ داریاں اُس ہی کے فرائض میں شامل تھیں۔ بہت کم ہی اسے کسی سے بات کرتے دیکھا اور سنا جاتا۔ وہ تو بس سر جھکائے یوں

”اچھا آپا..... یہ بتائیں کہ ہمارے ملک کا بچہ بچہ رات دن اللہ رسول کا نام لیوا۔ پانچوں وقت گلی گلی اذانیں گونجتی ہیں تو پھر ہمارے یہاں ہی اتنی بے برکتی کیوں؟“ مجید کرمانی نے آپا صغریٰ کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

”بھیا جب دلوں میں ایمان کی حرارت نہ رہے تو پھر برکتیں بھی اٹھ ہی جایا کرتی ہیں۔“ اب ٹھیک سے کہا نہیں جاسکتا کہ ان کے لہجے میں طنز تھا یا تاسف۔

لیکن ابھی آپا صغریٰ کوئی جواب دے پاتی اس سے قبل ہی کمرے میں ایک قدرے دھیمی اور مودبانہ سی آواز گونجی۔ ”جی کھانا لگ گیا ہے۔ آپ سب لوگ ڈائننگ روم میں تشریف لے آئیں۔“ یک بیک سب کی نگاہیں کمرے کے داخلی دروازے کی طرف اٹھ گئیں جہاں ماسی برکت کھڑی ان سب کو ڈائننگ روم کی جانب چلنے کا اشارہ کر رہی تھی۔

ڈائننگ روم کے صوفوں پر براجمان وہ آٹھ کے آٹھ افراد یوں سرعت کے ساتھ اٹھ کھڑے ہوئے جیسے اسی صدا کے انتظار میں ہی تو بیٹھے تھے۔ آپا صغریٰ اور ان کے شوہر حبیب بلگرامی سب میں معمر نظر آتے تھے۔ صاحب خانہ و میزبان مجید کرمانی اور اس کی بیوی مہر النساء نے احتراماً انہیں آگے بڑھنے کا اشارہ کیا۔ ویسے بھی سب پران کا احترام واجب بھی تھا کیونکہ وہ تینوں بھائیوں کی اکلوتی بڑی بہن تھیں۔ اس کے بعد مجید کرمانی کا نمبر آتا تھا۔ مجید کرمانی منجھلا جبکہ ظہیر کرمانی سب بھائیوں میں چھوٹا تھا۔

یہ ان چاروں بہن بھائیوں کا برسوں پرانا دستور تھا۔ وہ سب ہر ماہ کے پہلے اتوار کو کسی ایک کے گھر پر صبح گیارہ کے قریب جمع ہوتے۔ خوب ادھر ادھر کی باتیں ہوتیں۔ مزے سے دو پہر کا کھانا تناول کیا جاتا۔ پھر

اپنے کام میں مگن رہتی جیسے کام نہ کر رہی ہو، عشق کر رہی ہو کیونکہ عشق اور وہ بھی سچے عشق میں ہی انسان اتنا مگن رہتا ہے۔ اب اسے یہ عشق کس سے تھا، اپنے کام سے یا اپنے آپ سے۔ یہ بات ہنوز ایک معمہ ہی تھی۔

ماسی برکتے کے بارے میں تو خود مجید کرمانی اور اس کی بیوی اس سے زیادہ نہ جانتے تھے کہ وہ ریلوے کالونی میں پٹریوں کے اس پار کوارٹر نمبر ۳۶ میں اپنے اکلوتے بیٹے صابر کے ساتھ اپنے شوہر جو کہ ممکنہ ریلوے میں کاٹا بلڈ لے پر ملازم تھا، کی اچانک وفات کے بعد بیوگی کے دن گزار رہی ہے۔ اب وہ ہی صابر کی واحد کفیل تھی لیکن یہ باتیں تو خود ماسی برکتے نے ہی انہیں اس وقت بتائی تھیں جب وہ سولہ سال پہلے ریلوے کالونی ہی کی ایک عورت جو کہ مجید کرمانی کی ساتھ والی کونجی میں کام کرتی تھی، کے حوالے سے کام حاصل کرنے کی غرض سے آئی تھی۔

ان سولہ سالوں میں مجال ہے کہ ماسی برکتے نے کبھی ماسوائے مقررہ چھٹیوں اور وہ چند ایک چھٹیاں جو اس نے بطور خاص مہر النساء سے کہہ کر اور جس کے عوض اس کی تنخواہ کاٹی جاتی تھی، حاصل کی تھیں، کوئی بھی ناغہ کیا ہو یا جو کبھی ایڈوانس یا ادھار کا ہی تقاضا کیا ہو۔ وہ اپنے وقت پر روز کام پر آ جاتا کرتی اور وقت ہوتے ہی اپنی سیاہ چادر میں خود کو لپیٹ کر چلی جاتی۔ خود گھر والے بھی اس کی خاموش طبیعت سے اچھی طرح آگاہ ہو چکے تھے اور وہ بھی بس اس کام ہی سے متعلق بات چیت کیا کرتے۔

ہاں پہلے کسی حد تک بات الگ تھی جب مجید کرمانی کے دونوں بیٹے منیب اور مجیب پاکستان میں تھے۔ جب ماسی برکت اس گھر میں اولین کام کرنے آئی تھی تو وہ دونوں بمشکل آٹھ دس سال ہی کے تو تھے لیکن تھے دونوں ہی بلا کے شرارتی۔ دونوں ماسی برکتے کو شرارتا ”ماسی بے برکتے“ کہہ کر چھیڑتے اور پھر ان کی دیکھا دیکھی ہر کسی نے ماسی برکتے کو ماسی بے برکتے ہی کہنا اور بلا نا شروع کر دیا۔

ماسی برکتے تو نہ معلوم کس مٹی کی بنی ہوئی تھی۔ اسے تو جیسے کوئی فرق ہی نہ پڑتا ہو۔ نہ تو کبھی کسی نے اس کے چہرے پر ماسی بے برکت بلائے جانے پر کوئی شکن دیکھی اور نہ کبھی لب پر کوئی شکایت۔

ان گزشتہ سولہ برسوں میں بہت کچھ بدل چکا تھا۔ منیب اور مجیب پچھلے سات سالوں سے امریکہ جا بسے تھے۔ گئے تو وہ تعلیم حاصل کرنے تھے لیکن آس پڑوس والے تو یہ بھی کہتے ہیں کہ دونوں نے وہاں جاتے ہی گرین کارڈ کے حصول کی خاطر گوریوں سے شادیاں رچا لی ہیں۔ الغرض جتنے منہ اتنی باتیں۔ لیکن ماسی برکتے نے حقیقت جانتے ہوئے بھی نہ تو کہیں باہر ہی کی کسی بات کا کوئی تذکرہ چھیڑا اور نہ ہی کبھی گھر میں کسی سے کوئی سوال کیا۔

ان گزرے برسوں کے دوران ماسی برکتے میں ظاہری طور پر اگر کچھ فرق آیا تھا تو وہ صرف اتنا کہ اب اس کے سیاہ بالوں میں چاندی کے تار تارے کثیر تعداد میں نمودار ہو چکے تھے کہ ان کی اوٹ سے خال خال ہی کوئی سیاہ بال جھانکتا نظر آتا۔ ہلکی گندمی رنگت والے چہرے پر اب جا بجا جھریوں نے اپنے جالے تان لیے تھے۔ اوسط سے قدرے چھوٹا قد۔ جسم پر ہمیشہ ملیشیا رنگ کی شلوار قمیص جس کے اوپر سر کوڈھانپتی ہوئی بڑی سیاہ چادر۔ چہرے پر ہر وقت ہلکورے لیتی ایک نہ معلوم سکون و قناعت کی کیفیت اور ساتھ ایک ایسی دھیمی سی مسکراہٹ جسے کوئی بھی معنی دینا بڑا ہی مشکل تھا۔ ماسی برکتے کے چہرے کی وہ دھیمی مسکراہٹ اور اس کی بڑی بڑی سیاہ آنکھوں سے کسی خاموش و پرسکون سی جھیل کا سا سکوت مل کر چہرے پر ایک ملکوتی نور سا پھیلا دیتا تھا۔ اگر یہ کہا جائے کہ وہ ایک گھریلو کام والی ماسی سے زیادہ کوئی اللہ والی مائی لگتی تھی تو شاید غلط نہ ہو گا۔

یوں تو وہ ہمیشہ ہی دعوتوں کے کھانے کچھ ایسے پکایا کرتی تھی کہ کھانے والے انگلیاں ہی چاٹتے رہ جاتیں لیکن آج تو اس نے اپنی ایڑی چوٹی کا زور لگا دیا تھا کہ کھانے ایسے پکس کہ کھانے والوں کی عمر بھر یاد رہے۔

آج ماسی برکتے کا اس گھر میں آخری دن تھا۔ ویسے تو اس نے مہر النساء کو دو ماہ قبل ہی کہہ دیا تھا اب وہ مزید اپنی ملازمت کو جاری نہ رکھ سکے گی کیونکہ اب اس کا بیٹا صابر نہیں چاہتا کہ وہ مزید کام کرے۔ مہر النساء نے جب یہ بات مجید کرمانی کو بتائی تو پہلے تو وہ بڑا حیران ہوا اور

مل جایا کرتی۔ اللہ کی برکتیں تو اس کے خاص الخاص بندوں کا مقدر ہوا کرتی ہیں۔“ مجید کرمانی اپنی پلیٹ میں بریانی کے ساتھ سلاد اور رائتہ ڈالتے ہوئے بولا۔

”بے شک بے شک ایسا ہی ہے۔“ آپا صغریٰ شامی کباب کا ٹکڑا چبچ کی مدد سے کاٹ کر منہ میں ڈالتے ہوئے بولی۔ ”یہ تو اس کی رضا ہے، جسے چاہے نواز دے۔“

”جی جی آپا بجا ارشاد فرمایا۔ اب آپ اس ماسی بے برکتے ہی کو دیکھ لیں۔“ مجید کرمانی نے ڈائننگ ٹیبل کے چہار اطراف ادھر ادھر دوڑ کر تیزی سے خالی ہوتے سالن کے ڈونگوں اور برانی کی طشتیوں کو دوبارہ بھرتی ماسی برکتے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ”یہ سال ہا سال سے ہمارے پاس کام کر رہی ہے۔ نہ اس کا حال بدلا نہ حلیہ۔ جانو جیسے برکت تو اس کو چھو کر ہی نہیں گزری۔ جیسی آئی تھی آج بھی ویسے ہی ہے اور اب تو محترمہ کو ایک نئی سوجھی ہے۔ چلتی روزی کو لات مار رہی ہے۔ مہر النساء نے اسے کتنا سمجھایا، تنخواہ تک بڑھانے کا لالچ دیا لیکن یہ ماسی توٹس سے مس ہونے کو تیار نہیں۔“

وہ سب ماسی برکتے کو ہدف بناتے ہوئے یوں باتیں کیے چلے جا رہے تھے جیسے اس کی وہاں موجودگی سے ہی یکسر ناواقف ہوں اور ماسی برکتے کا حال یہ تھا کہ جیسے یا تو وہ یہ ساری گفتگو سن ہی نہ رہی ہو اور اگر سن بھی رہی ہو تو جیسے موضوع سخن وہ نہیں بلکہ کوئی اور ہی ہو۔

”جی جی مجید بھائی، اس طبقے کی تو بس چال بے ڈھنگی جو پہلے تھی سو اب بھی ہے۔ پھر بھلا کیا خاک برکت ہونی ہے۔“ حمید کرمانی کی بیوی عالیہ کے لہجے میں طنز کی ترشی اپنی شدت پر تھی۔

”ہاں کہتی تو تم ٹھیک ہو عالیہ لیکن اب یہ بات ماسی بے برکتے ہی تک موقوف نہیں رہی۔ ارے بھائی ہر ماہ پنشن کی رقم آ جاتی ہے۔ منیب اور مجیب باقاعدگی سے ہر ماہ ایک اچھی خاصی رقم بھیج دیتے ہیں اور کچھ دوران ملازمت پس انداز کردہ پونجی جو کہ بینک کے فکس ڈیپازٹ کھاتے میں پڑی ہے، وہاں سے کچھ نہ کچھ آ رہتا ہے مگر مانو جیسے اب تو نوٹوں میں بھی وہ تاثیر نہیں رہی۔ بڑے سے بڑا نوٹ بھی اب تو دن بہ

پھر یہ سوچ کر پریشان بھی کہ ماسی برکتے جیسی ملازمہ اب دوبارہ ہرگز نہیں ملے گی۔ اس کے کہنے پر مہر النساء نے ماسی برکتے کو بہتر سمجھایا، تنخواہ بڑھا دینے کا لالچ بھی دیا لیکن ماسی برکتے نے تو جیسے ٹھان ہی لی تھی کہ اب وہ کسی طور پر بھی ملازمت نہ کرے گی۔ تھک ہار کر مہر النساء نے اس وقت تک کے لیے مزید کام کرنے کی حامی بھر والی جب تک یہ دعوت نہیں ہو جاتی۔ پھر بھلے ہی سے وہ اگلے روز سے کام پر نہ آئے۔ سو اب دعوت والا دن بھی آن پہنچا اور یہ ماسی برکتے کا وہاں آخری دن تھا۔ تمام لوگ جیسے ہی ڈائننگ روم میں داخل ہوئے تو بڑی سی میز کو مختلف اقسام کے کھانوں اور دیگر لوازمات سے انتہائی مہارت سے سجا دیکھ کر وہ ایک بار پھر ماسی برکتے کی قابلیت کے قائل ہو گئے۔

”واہ ماسی بے برکتے..... کیا بات ہے تیری، کھانوں کی خوشبو ہی بتا رہی ہے کہ آج تو بس مزہ ہی آجائے گا۔“ ظہیر کرمانی کچھ شوخ سا ہوتا ہوا بولا۔ ویسے بات کچھ ایسی غلط بھی نہ تھی۔ ڈائننگ روم میں پھیلی ہوئی کھانوں کی خوشبو سے سب کے منہ میں پانی بھر آیا تھا۔

مجید کرمانی نے آپا صغریٰ اور اپنے بہنوئی حبیب بلگرامی کو بڑے ہونے کے ناطے ڈائننگ ٹیبل پر سب سے آگے والی نشستوں پر بیٹھنے کا اشارہ کیا اور خود اپنے ہاتھوں سے کرسیوں کو ان کے بیٹھنے کے لیے کھسکا کر جگہ بنائی۔ ان کے بیٹھتے ہی سب لوگ اپنی اپنی نشستوں پر براجمان ہو گئے۔ آپا صغریٰ نے پہلے تو با آواز بلند بسم اللہ پڑھی اور پھر بڑے ہی خشوع خضوع کے ساتھ اہل خانہ اور خاندان بھر کے حق میں کشادگی رزق، فروغ خلوص و محبت اور سلامتی کی دعائیں مانگیں اور پھر باقاعدہ دعوت کا آغاز ہوا۔

”اچھا رشیدہ کیا کہہ رہی تھی تم، ہاں یاد آیا۔ بھلا ان گوروں کی برکت بھی کوئی برکت ہے۔ نری خالی خولی دنیاوی برکت اور آخرت میں ٹھیک گا۔“ آپا صغریٰ نے ڈونگے سے سالن پلیٹ میں ڈالتے ہوئے کہا۔ ”سولہ آنے کھری بات کہی ہے آپا صغریٰ نے۔“ حمید کرمانی نے یوں سر دھنتے ہوئے کہا کہ جیسے یہ بات سن کر وہ وجد ہی میں تو آ گیا ہو۔

”جی آپا آپ نے بالکل درست کہا۔ حقیقی برکت بس یونہی نہیں

دن اپنی قوت خرید کھوتا چلا جا رہا ہے۔ پیسہ کتنا ہی کیوں نہ ہو، کم ہی پڑتا ہے۔“ مجید کرمانی لقمہ نکلتے ہوئے بولے۔ ”تو بھائی صاحب، پھر تو ماسی بے برکتے کے جانے کے بعد بھابھی کو تو کھانے پکانے اور دیگر گھریلو امور میں کافی مشکلات کا سامنا کرنا پڑ جائے گا۔“ ظہیر جو کہ کھانا کھا کر اب گاجروں کے حلوے سے لطف اندوز ہو رہا تھا، بولا۔

”ہاں یہ تو ہے لیکن اب ہو بھی کیا سکتا ہے۔ یہ کسی طور ماننے کو تیار ہی نہیں ہے۔“ مجید کرمانی کے بولنے سے پہلے ہی اس کی بیوی مہر النساء بول پڑی۔ ”لیکن امید ہے کہ چند ایک روز میں نئی ماسی بھی مل ہی جائے گی۔ میں نے آس پڑوس میں سب سے کھلوادیا ہے۔“

سب کھانا کھا چکنے کے بعد اب میز پر تین چار پانچ اقسام کی شیرینیوں سے لطف اندوز ہو رہے تھے۔ ماسی برکتے جلدی جلدی سالنوں کے ڈونگے، قاپیں، بریانی کی طشتیاں اور استعمال شدہ پلیٹیں اٹھا کر واپس باورچی خانے میں لے جا رہی تھی۔ سب لوگ فارغ ہو کر اپنی اپنی نشستوں سے اٹھ کھڑے ہوئے۔ مہر النساء نے سب کو واپس ڈرائنگ روم کی طرف چلنے کا اشارہ کرتے ہوئے کہا ”میرا خیال ہے اب ایک پیالی گرما گرم چائے ہو جائے۔“ پھر ماسی برکتے کی طرف دیکھتی ہوئی بولی۔ ”بھئی ایسا کرو کہ دودھ والی اور سبز دونوں ہی چائے بنا لاؤ۔ ہاں سبز چائے میں ڈالنے کے لیے لیموں کی قاشیں لانا ہرگز نہ بھولنا۔“

کوئی آدھے گھنٹے بعد ماسی برکتے چائے کی ٹرالی جس پر دو بڑی گرما گرم بھاپ اڑاتی کیتلیاں لدی ہوئی تھیں، دھکیلتی ہوئی ڈرائنگ روم میں داخل ہوئی۔ سب لوگ دو مختلف گروپوں میں بٹ چکے تھے۔ ایک گروپ میں خواتین اور دوسرے میں مرد آپس میں خوش گپیوں میں مصروف نظر آ رہے تھے۔ چونکہ وہ تمام لوگوں کی پسند اور ذوق سے بخوبی آگاہ تھی، لہذا پہلے ہر ایک کو اس کی پسند کی مناسبت سے چینی اور دودھ کے ساتھ سیاہ چائے اور پھر آپا صغریٰ اور مجید کرمانی کو سبز چائے کی پیالیاں رکابی میں لیموں کی قاشوں کے ساتھ پیش کیں۔

ماسی برکتے جانتی تھی کہ اب یہ لوگ پورے اطمینان سے چائے کا

مزه لیتے ہوئے دھیرے دھیرے چائے نوش کریں گے۔ یہ سوچ کر چائے کی ٹرالی کو موڑ کر ڈرائنگ روم سے باہر نکال کر لے جانے کے لیے دھکیلنا شروع کیا ہی تھا کہ اچانک کمرے میں لگے انٹرکام کی گھنٹی بجنا شروع ہو گئی۔ مجید کرمانی نے اٹھ کر چونکا کان سے لگایا اور دوسری طرف سے کہی جانے والی بات سنتے ہی اس نے اپنی کلائی پر لگی کھڑی دیکھی اور بولا: ”اودہ..... اچھا اودہ آگیا ہے۔ ایسا کرو اسے وہیں روکو۔“ پھر ایک مختصر سا وقفہ لے کر بولا ”اچھا ایسا کرو، اسے اندر ہی بھیج دو۔“ اتنا کہہ کر اس نے چونکا واپس اپنی جگہ پر رکھ دیا اور ماسی برکتے سے مخاطب ہوا۔ ”ارے بھی تمہارا لڑکا صابر تمہیں لینے آگیا ہے۔ میں نے سوچا کبھی اسے دیکھا نہیں چلو آج اسے دیکھ ہی لیں۔ ویسے ہے بڑا ہی وقت کا پابند۔ تم نے کہا تھا کہ وہ تم کو شام پانچ بجے لینے آجائے گا تو بھئی اس وقت شام کے پانچ ہی تو بج رہے ہیں۔“ اس کے چہرے پر حیرانی اور تحسین کے ملے جلے تاثرات تھے۔

چند ہی لمحات میں ایک چھبیس اٹھائیس سالہ نوجوان ڈرائنگ روم میں داخل ہوا۔ اوسط سے قدرے نکلتا ہوا قد، سلیقے سے سنورے گہرے سیاہ بال، روشن کشادہ پیشانی، مناسب ناک، نقشہ، چہرے کا رنگ ماسی برکتے کے جیسا ہی ہلکا سا نوا لگر ایک وقار اور ٹھہراؤ، اس نے سفید بے داغ نہایت ہی عمدہ تراش کی قمیص، نفاست سے سلی گہری سیاہ رنگ کی کلف لگی کاٹن کی پتلون اور پیروں میں چمکتے سیاہ جوتے پہن رکھے تھے۔ غالباً کوئی بڑا ہی نفیس سا پرفیوم بھی لگا رکھا تھا کیونکہ اس کے آتے ہی کمرے میں ایک بڑی پیاری سی خوشبو بھی پھیل گئی تھی۔ وہاں موجود تمام لوگ تو بس جیسے اسے دیکھتے ہی رہ گئے۔

”جی فرمائیں۔“ مجید کرمانی نے نوجوان سے حیرت بھرے لہجے میں پوچھا۔ نوجوان نے ابھی کچھ کہنے کے لیے منہ کھولا ہی تھا مگر اس سے پہلے ہی ماسی برکتے بول اٹھی ”مجید صاحب، یہ میرا بیٹا ہے..... صابر..... ڈاکٹر صابر.....!“

وہاں موجود کسی کو بھی اپنے کانوں پر اعتبار نہ آ رہا تھا کہ انہوں نے وہی سنا ہے جو ماسی برکتے نے ابھی ابھی کہا تھا۔ ان سب کی سوچوں کا

سلسلہ ڈاکٹر صابر کی صدائے درہم برہم کر دیا۔ ”السلام علیکم“ لیکن بھلا وہاں سلام کا جواب دینے کا ہوش ہی کسے تھا۔ وہ سب تو اپنی پتھرائی ہوئی آنکھوں سے کبھی ماسی برکتے کی طرف دیکھتے تو کبھی اس کے بیٹے ڈاکٹر صابر کی طرف۔

”اچھا مجید صاحب..... اجازت دیں، اب میں چلوں گی۔ میرا حساب تو بیگم صاحبہ نے صبح ہی کر دیا تھا۔ مجھ سے کوئی گستاخی ہوئی ہو تو میں معافی چاہتی ہوں۔“ اتنا کہہ کر ماسی برکتے اپنے بیٹے کے پاس آئی اور بولی ”چلو بیٹا صابر چلیں۔“ دونوں ماں بیٹا مڑ کر چلتے ہوئے ڈرائنگ روم کے دروازے کی چوکھٹ پر پہنچے ہی تھے کہ لیکنٹ ماسی برکتے رک گئی۔ وہ ڈرائنگ روم کی طرف مڑی اور پھر وہاں دم سادھ کر بیٹھے تمام لوگوں پر ایک گہری نگاہ ڈالی۔ ایسا محسوس ہوتا تھا کہ جیسے وہ سب کسی الف لیلوئی کہانی کے کرداروں کی طرح سے پتھر کے بن گئے ہوں۔

”معافی چاہتی ہوں صاحب جی، اگر اجازت ہو تو کچھ کہنا چاہتی ہوں۔“ ماسی برکتے کی بات سن کر مجید کرمانی مدھم سی اجنبی آواز میں فقط اتنا ہی بول پایا۔ ”ہاں کہو۔“

ماسی برکتے دھیمی سی پرسکون آواز میں گویا ہوئی۔ ”اللہ بخشنے میرا مرحوم ابا کہا کرتا تھا کہ اللہ کے فرشتے برکت لے کر وہاں اترتے ہیں جہاں کوئی کسی کا دل نہ دکھائے۔ جب میں آپ لوگوں کو کھانے کے لیے آنے کا کہنے آئی تو مجید صاحب آپا صغریٰ سے یہ پوچھ رہے تھے کہ جب ہمارے ملک کا بچہ بچہ رات دن اللہ رسول کا نام لیا اور پانچوں وقت گلی گلی اذانیں گونجتی ہیں تو آخر ہمارے ہی اتنی بے برکتی کیوں ہے؟ میں ٹھہری ایک جاہل عورت، بھلا ان سب باتوں کو کیا جانوں۔ اتنا ضرور جانتی ہوں کہ جو کچھ ہمارے یہاں ہو رہا ہے، اس کے ہوتے ہوئے برکت اگر ہم سے روکھ نہ جائے تو اور کرے بھی کیا؟ صاحب جی..... میرا مرحوم ابا کہا کرتا تھا کہ جب کسی مظلوم پر ظلم ہوتا ہے تو اس کی آہ بڑی ہی اثر والی ہوتی ہے۔ آسمان چیر ڈالتی ہے..... کتنا سچ کہتا تھا میرا بہشتی ابا..... یہاں دن رات مسلسل جس طرح سے معصوموں، غریبوں، محتاجوں، مسکینوں سے ان کے جینے کا حق چھینا جا رہا ہے، گھر جلانے جا رہے ہیں، بیماروں

کو بے گناہ چن چن کر مارا جا رہا ہے، مال الماک چھینی جا رہی ہیں۔ انصاف دینے والا اور ان کی فریاد سننے والے سوائے خدا کے کوئی اور نہیں۔ جو محنت مشقت کر کے رزق حلال کمائے وہ کمی کمین کہلائے۔ کبھی انہیں علم تو کبھی طاقت، تو کبھی حیثیت و مرتبے کے بل بوتے پر زندہ درگور کیا جاتا ہے تو ان سب دکھی دلوں سے نکلتے نالے، آہیں، فریادیں جب آسمان سے ٹکراتی ہوں تو پھر آسمان سے برکت و رحمت نہیں برسا کرتی، عذاب ہی برستے ہیں.....!“

اتنا کہہ کر ماسی برکتے نے ساتھ کھڑے صابر کی طرف دیکھا اور اپنا ایک ہاتھ اس کے کاندھے پر رکھ دیا۔ صابر نے پہلے تو ماں کے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھا اور پھر بڑے پیار سے اسے اپنے ہاتھ میں لے لیا ”صاحب جی، آپ بھی سوچتے ہوں گے بھلا اس بیوہ ماسی ”بے برکتے“ نے اپنے بیٹے کو ڈاکٹر اور وہ بھی امریکہ پلٹ ڈاکٹر کیسے بنا لیا۔“ ماسی برکتے نے بطور خاص ”بے“ پر زور دیتے ہوئے کہا۔ ”یہ سب میرے مولا جو بڑا رحمن و رحیم ہے، ہی کی برکت ہے جو آج مجھ غریب بیوہ کا یتیم بیٹا ڈاکٹر بن گیا۔“ اس نے اپنی شہادت کی انگلی سے اوپر اٹھا کر اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

”آج سے سولہ سال پہلے میرا خاوند کریم اچانک گزر گیا تو مجھے ریلوے سے اس کے فنڈ کی جو رقم ملی وہ میں نے اسٹیشن ماسٹر جس کے نیچے وہ کاغذ بنانے کی نوکری کرتا تھا، کے مشورے پر اس کے ہمراہ جا کر ساری کی ساری بینک کے لمبی مدت والے کھاتے میں جمع کرادی تھی اور ملنے والی ماہانہ پنشن اور ملازمت سے حاصل ہونے والی تنخواہ سے اپنے صابر کو ایک اچھے اسکول میں داخل کرادیا۔ شاباش ہے میرے صابر پر جو میٹرک میں پورے صوبے میں ساتویں نمبر پر پاس ہوا اور اس کا داخلہ ڈاکٹری کے ابتدائی کالج میں ہوا جہاں وہ اپنی قابلیت سے پھر صوبے بھر میں چوتھے نمبر پر پاس ہوا اور ساری فیس معاف کروا کر ڈاکٹری کے بڑے کالج میں داخلہ حاصل کر لیا۔ وہ وہاں سے ڈاکٹر بن گیا تو اس کی کامیابی اور ذہانت دیکھ کر امریکہ کے بہت بڑے ڈاکٹری کے کالج والوں نے دل کے مریضوں کا ماہر بنانے کے لیے اسے وہ دے دی.....

اے بیٹا صابر وہ کیا ہوتی ہے کالرپ.....“

”اماں! کالرپ نہیں، اسکا لرشپ یعنی وظیفہ۔“ صابر مسکراتے

ہوئے بولا۔

”ہاں ہاں وہی وہی، اسکا لرشپ اور اس وقت میں نے اپنے بینک کے کھاتے سے ساری رقم نکلا کر اپنے صابر کو ہوائی جہاز کا ٹکٹ خرید کر امریکہ روانہ کر دیا۔ اب یہ تین ماہ پہلے دل کی بیماری کا ماہر ڈاکٹر بن کر واپس پاکستان آ گیا ہے میرے کہنے پر۔ ورنہ وہ لوگ تو اسے لاکھوں ڈالر سالانہ کی تنخواہ پر وہیں رکھنے کا کہہ رہے تھے لیکن میں نے اسے پہلے ہی کہہ دیا تھا کہ کان کھول کر سن لے صابر، تجھ پر اس مٹی، اس زمین اور اس وطن کا قرض ہے اور یہ قرض تجھے واپس آ کر اتارنا ہے۔ تو بس اب یہاں رہ کر اپنی دھرتی ماں کا قرض اتارے گا اور اپنی اس بوڑھی ماں کی خدمت کرے گا۔“ ماسی برکتے

کا لہجہ گلوگیر اور اس کی آنکھیں چم چم نہر بہا رہی تھیں۔ صابر کی آنکھیں بھی آنسوؤں سے ڈبڈبائی ہوئی تھیں۔

اتنا کہہ کر ماسی برکتے نے جس میں شدت جذبات سے اب مزید کچھ کہنے کا کوئی حوصلہ نہ رہا، اپنا ہاتھ سر تک لے جا کر سب کو سلام کیا، صابر کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں پکڑ کر جانے کو مڑ گئی۔ وہاں بیٹھے سب لوگوں کو ایسا محسوس ہوا کہ جیسے ماسی برکتے محض صابر کا ہاتھ تھامے نہ جا رہی ہو بلکہ اپنے ضعیف ہاتھوں میں سارے زمانے کی برکتوں کو تھامے چلی جا رہی ہو.....!

(سمہ ماہی فنون ۱۳۶)

☆.....☆.....☆

انتخاب (بیگم شائستہ اکرام اللہ)

انتخاب

قائد اعظم، ایک بے مثال رہنما

(بیگم شائستہ اکرام اللہ)

قائد اعظم نے مساوی طور پر سیاست میں خواتین کی شرکت کو تسلیم کیا۔ عورتوں کو بھی اس نظم و ضبط اور تادیبی کارروائیوں کا پابند ٹھہرایا گیا جو مرد ممبران کے لیے ضروری تھیں اور جب قائد اعظم نے مردوں کو برطانوی حکومت کی جنگ کی کوششوں میں ان کے ساتھ تعاون نہ کرنے کا حکم دیا تو ساتھ ہی عورتوں کو بھی ایسا کرنے کا حکم دیا۔ قائد اعظم کو یہ توقع تھی کہ مسلم لیگ میں شمولیت اختیار کرنے والے لوگ کسی قربانی سے دریغ نہیں کریں گے۔ ۱۹۴۵ء میں پیپفک ریلیشنز کانفرنس میں حکومت ہند نے مجھ سے شرکت کے لیے کہا لیکن قائد اعظم نے مجھے اس میں شرکت کی اجازت نہیں دی انہوں نے اس موقع پر جیسا کہ وہ پہلے بھی کئی موقعوں پر ایسا کر چکے تھے، انکار کی وجہ بڑے تحمل، تفصیل سے بیان کرنے کی مصیبت اپنے ذمہ لے لی اور آخر کار اپنے دلائل کی بدولت انہوں نے مجھے اپنا فیصلہ قبول کرنے پر راضی کر لیا اور جب میں جانے کے لیے اٹھی تو انہوں نے مزید یہ کہا کہ ایک دن تم باعزت طریقے سے مسلم لیگ کی نمائندہ بن کر جاؤ گی۔ وہاں تمہیں مسلم لیگ کی جانب سے بولنے کا پورا پورا حق حاصل ہوگا۔ انہوں نے یہ بات یاد رکھی کیونکہ چھ ہفتے کے بعد ہی پاکستان معرض وجود میں آ گیا تو قائد اعظم نے مجھے پاکستان کی نمائندہ (مندوب) کی حیثیت سے اقوام متحدہ میں جانے کا حکم دیا لیکن میں خرابی صحت کی بنا پر نہ جاسکی۔ انہوں نے مجھے اگلے سال بھیجا لیکن مجھے افسوس ہے کہ وہ زیادہ دن زندہ نہ رہ سکے تاکہ وہ مجھے بتا سکتے کہ ان کا انتخاب درست تھا۔ قائد اعظم محض جذباتیت اور جوش کی حوصلہ افزائی نہیں کرتے تھے بلکہ لوگوں کو حقیقت پسندانہ رویہ اختیار کرنے کی تعلیم دیتے تھے میں نے نہیں مسلم لیگ فنڈ میں دیئے ہوئے زیورات خواتین کو یہ کہہ کر واپس کرتے ہوئے دیکھا۔ ”ایسا کرنے سے پہلے اپنے شوہروں کی رائے معلوم کرلو۔“ کیونکہ وہ ڈرامائی کارروائی کے مقابلے میں ٹھوس اور عملی کام کو سراہا کرتے تھے۔

جب ہندوستان ٹائمز کے ایک مضمون میں مجھے پہلی بار تنقید کا نشانہ بنایا گیا تو میں قائد اعظم کے پاس پہنچی۔ مجھے ان سے ہمدردی کی توقع تھی۔ انہوں نے کہا کہ سیاست میں داخل ہونے کے بعد تمہیں اس قسم کی تنقید کی توقع کرنی چاہیے، یہ تو اس بات کا ثبوت ہے کہ تمہارے کارناموں کو بھی اہمیت دی جانے لگی ہے۔ قائد کی کرسی نے ساتھ ہمیشہ اخبارات کا ڈھیر لگا رہتا انہوں نے اس میں سے ہندوستان ٹائمز کی ایک کاپی اٹھائی اور اس مضمون پر ایک سرسری نگاہ ڈالی جس کا میں نے ذکر کیا تھا اور پھر انہوں نے ایک لمحے کے لیے کچھ کہے بغیر بڑی احتیاط سے اخباروں کو وہیں رکھ دیا۔ انہوں نے کہا میرے متعلق بھی ہر روز اخبارات نہایت بری باتیں لکھتے رہتے ہیں لیکن اگر میں ان کا اثر لوں تو سوچو پھر کیا ہوگا۔ میں شرمسار ہوئی اور جونہی جانے کے لیے اٹھی انہوں نے مزید کہا ”تمہیں معمولی معمولی باتوں پر پریشان نہیں ہونا چاہیے۔“ بعد کے سالوں میں جب بھی مجھے گھٹیا قسم کی تنقید کا سامنا کرنا پڑا میں نے قائد اعظم کے یہ الفاظ یاد رکھے۔

محترمہ حمیدہ بیگم

حالاتِ زندگی بقلم خود

قارئین، بتول کے لئے حمیدہ بیگم مرحومہ کی شخصیت کسی تعارف کی محتاج نہیں۔ وہ جامع کمالات و صفات ہستی جنہوں نے قیام پاکستان کے بعد خواتین میں دعوتِ دین کے منظم کام کی بنیاد رکھی۔ پھر ان ہی کی نگرانی میں ادارہ بتول قائم کیا گیا جس کے تحت 1955ء میں ماہنامہ ”عفت“ اور بعد ازاں نومبر 1957ء میں ماہنامہ ”بتول“ کا اجرا ہوا۔ بعد میں ادارہ بتول نے بچوں کیلئے ماہنامہ ”نور“ بھی جاری کیا۔ ان دونوں رسالوں کی بانی ایڈیٹر حمیدہ بیگم اور رخشندہ کوکب تھیں۔ رخشندہ کوکب صاحبہ نے ”عفت“ کے اجراء کے بعد محترمہ حمیدہ بیگم سے ان کے حالاتِ زندگی لکھوائے جو پرچہ بند ہو جانے کی صورت میں چھپ نہ سکے۔ آج یہ تحریر بہت عرصہ بعد پرانے کاغذات سے ملی ہے۔ 1956ء میں لی گئی یہ تحریری ملاقات ان کے یومِ وفات کی مناسبت سے نذر قارئین ہے۔ حمیدہ بیگم نے 14 ستمبر 1973ء جمعرات اور جمعہ کی درمیانی شب اس جہانِ فانی سے کوچ کیا۔ (آسیہ راشد)

پہلے بہنوئی پھر بہن اور اس کے بعد مجھ سے بڑی بہن فوت ہو گئیں۔ یہ سب حادثات تین چار سال کے اندر اندر ہو گئے۔ والدہ صاحبہ مرحومہ کی نیک مثال اور مدرسہ میں حاصل کی ہوئی تعلیم کے اثر سے یہ تو پختہ یقین تھا کہ مرنے کے بعد جی کراٹھنا ہے اور اٹھ کر اپنے سب کاموں کا حساب دینا ہے۔ ان تین قوتوں نے اس خیال کو اور غالب کیا اور یہ شوق پیدا ہو گیا کہ ٹھیک ٹھیک خدا کی مرضی معلوم کی جائے اور قرآن کا مطلب سمجھنے کی دھن لگ گئی۔

قرآن کی تعلیم: اپنے دادا دادی تو دیکھے نہیں، دادا کے حقیقی بھائی سلامت تھے جو ہمیں بے حد چاہتے تھے۔ ان سے قرآن کا ترجمہ سیکھنا شروع کیا۔ قریباً آٹھ دس پارے ان سے پڑھے۔ اس کے بعد مولوی عبدالعزیز صاحب جو رشتہ میں بھائی لیکن عمر میں ابا جان سے بڑے ہیں، ان کی رہنمائی میں پورا قرآن ختم کیا۔ دادا جان مرحوم نے قرآن کے الفاظ اور مضامین سے تعارف کرایا اور اپنی مثال سے اسلامی زندگی کے کچھ پہلو دکھائے۔ مولوی صاحب نے قرآن کی روح اور ہر شعبہ زندگی میں اس پر عمل کرنے کا طریقہ دکھا دیا۔ خدا ان کو سلامت رکھے۔ سب ناؤں کے مرحلوں میں انہی کی رہنمائی نے لغزشوں سے بچایا اور اب تک ہر معاملے میں انہی کا مشورہ مددگار رہتا ہے۔

مروج تعلیم: سب سے زیادہ شوق تو اسلامی تعلیم کا تھا لیکن دادا ابا ہر

بہن رخشندہ کوکب صاحبہ کے اس حکم نے منوں بوجھ ڈال دیا ہے کہ حالاتِ زندگی لکھ کر بھیجو اور بہت جلد۔ یہ کام بے حد مشکل ہے لیکن انکار کی مجال نہیں جو کچھ لکھ رہی ہوں والدہ صاحبہ مرحومہ کی روایات اور اپنی یادداشت کے بھروسہ پر۔ غلطی کے امکان بہت زیادہ ہیں۔

تاریخ پیدائش: تحصیل حافظ آباد ضلع گوجرانوالہ کے ایک گاؤں کوٹ حسن خاں میں ہیں اس وقت پیدا ہوئی۔ جب جمعہ کی اذان ہو رہی تھی۔ مہینہ جون کا تھا، تاریخ کسی کو یاد نہیں۔ سن ۱۹۱۴ء تھا۔

تعلیم ابتدائی: ابا جان کی ملازمت دیہات میں رہتی تھی اس لئے تینوں بڑی بہنوں کو والدہ صاحبہ مرحومہ نے خود ہی قرآن اور اردو کی تعلیم دی۔ بہنوں کی دیکھا دیکھی میں نے بھی بہت چھوٹی عمر میں پڑھنے کا شوق ظاہر کیا اور پانچ سال سے پہلے پہلے قرآن مجید ختم کر لیا۔ چھ سال میں تھی کہ ابا جان جو ہمیشہ اپنی آمدنی کو حرام سمجھتے رہے تھے ملازمت کو چھوڑ کر مستقل طور پر شہر گوجرانوالہ میں سکونت پذیر ہو گئے۔ آبائی وطن بھی گوجرانوالہ ہی تھا۔ یہاں مجھ کو اسکول میں داخل کیا گیا۔ استانیوں نے ایسی محبت اور توجہ سے پڑھایا کہ دس سال کی عمر میں قریباً ساتویں جماعت کی قابلیت حاصل کر کے فارغ التحصیل ہو گئی۔

چند سال گھر پہ گزارے اور کھانا پکانا، سینا پرونا سیکھا۔ اسی دوران میں

سال پہاڑ پر چلے جاتے اور میرا پڑھنا چھوٹ جاتا میرے چچا (انہی دادا کے چھوٹے بیٹے) میرے ہم سبق تھے۔ وہ مجھ سے آگے نکل جاتے میں بدل ہو جاتی۔ شہر میں اور بھی کوئی اطمینان بخش انتظام نہ تھا۔ مولوی عبدالعزیز صاحب اگرچہ اپنے خاندان ہی کے تھے۔ لیکن ابا جان کی توجہ ان کی طرف اس وقت گئی جب میں بہت بڑی ہو چکی تھی۔ لہذا پھر اسکول میں داخل ہو گئی اب کے گورنمنٹ اسکول تھا۔ فضا غیر اسلامی اور پابندی نماز کو بحال رکھنا بھی جہاد عظیم تھا۔ خدا کا شکر ہے کہ اس نے اس جہاد کی توفیق دی اور باوجود بیسیوں رکاوٹوں کے ظہر کی نماز نہ چھوٹی بلکہ میری دیکھا دیکھی کئی اور لڑکیاں بھی پڑھنے لگیں۔ اس پر ہیڈ مسٹر لیس سے کچھ کشمکش بھی ہوئی لیکن بالآخر چپقلش دوستی میں تبدیل ہو گئی۔ میٹرک پاس کیا تو اسکول کا ریکارڈ ٹوٹا، وظیفہ آیا، لیکن میں کالج میں داخل نہ ہو سکی، صحت خراب تھی دوسرے گورنوالہ میں کالج نہ تھا اور والدین لاہور بھیجے پر رضا مند نہ تھے۔ اس اسکول میں جہاں ابتدائی تعلیم حاصل کی تو اس وقت تک انگریزی نہ تھی۔ اسکول والوں کی خواہش تھی کہ میں اس تعلیم کو وہاں شروع کروں تاکہ لڑکیاں انگریزی زبان تو سیکھیں لیکن ساتھ انگریزیت کے مفاسد سے محفوظ رہیں۔ ان کے اصرار پر کام شروع کر دیا۔ تعلیم دینے میں بھی خدا نے خاصی کامیابی دی۔ میرے مضمون میں سے کبھی کوئی لڑکی فیل نہ ہوئی اور لڑکیاں ہمیشہ اس کی خواہش مند رہیں کہ میں ان کو زیادہ سے زیادہ کام دوں۔ یہیں پڑھاتے پڑھاتے اسکول والوں کے کہنے پر ایف اے، بی اے کے امتحانات بھی دیئے ورنہ میں میٹرک پاس کرنے کے بعد کسی امتحان کی قائل نہ رہی تھی۔ میرا یہ خیال تھا کہ قابلیت بڑھانے کا جب کوئی ذریعہ نہیں ہے تو صرف نام کے آگے بی اے، ایم اے لکھوا لینے کا کیا فائدہ؟

ابا جان میری صحت کی خرابی کی وجہ سے نہ میری تعلیم کے حامی تھے نہ اسکول میں کام کرنے کے۔ لیکن مجھے دونوں چیزوں کا شوق تھا۔ آخر انہوں نے یہ کہا کہ اگر تم واقعی اسکول چھوڑنے کا ارادہ نہیں رکھتی تو پھر سیدھی طرح ٹریننگ حاصل کر کے باقاعدہ کام کرو۔ چنانچہ ساری تعلیم میں سے صرف بی ٹی ان کی مرضی کے مطابق کیا اور اس کے ایک سال بعد پڑھنے پڑھانے کو ختم کر دیا۔ بی ٹی کے دوران لاہور ہوسٹل میں رہی، تعلیم گاہوں کے نقص قریب

سے دیکھے اور مولانا (مودودی) کے خیالات کی صحت کا قائل ہونا پڑا۔ جن دنوں دادا ابا کے پاس پڑھتی تھی ایک دن ان کی میز پر ”ترجمان القرآن“ دیکھا۔ قرآن کو سمجھنے کا شوق تو بے انتہا تھا۔ اس کو اٹھانے کی اجازت چاہی۔ لیکن انہوں نے فرمایا یہ بہت دقیق ہے تمہاری سمجھ میں نہیں آئے گا۔ میں نے عرض کیا پڑھ کر تو دیکھوں کیا لکھا ہے۔ میرے لئے ساری کشش ”قرآن“ کے لفظ میں تھی۔ اس کو پڑھا اور جس مضمون نے متاثر کیا وہ بینکنگ اور انشورنس کا تھا۔ بقول دادا جان میں اس کو پورا تو نہ سمجھ سکی لیکن اس چیز نے دل پر اثر کیا کہ لکھنے والے نے سود اور جوئے کی شکل کو پچپانا اور حرام قرار دیا ہے۔ اس کے بعد ترجمان القرآن کو برابر دیکھتی رہی لیکن اس طرح کہ مولانا کے دلچسپ مضامین پڑھ لیتی، اشارات اور اجتماعات کی رودادیں یہ سوچ کر چھوڑ دیتی کہ ان میں جلسوں وغیرہ کی کارروائیاں ہوں گی جلسوں وغیرہ سے بھی مجھے نفرت تھی اس لئے ان کی کارروائیوں سے بھی کوئی دلچسپی نہ تھی۔ آخر مولوی عبدالعزیز صاحب نے بتایا کہ مولانا کی ایک بہت اچھی کتاب شائع ہوئی ہے، اس کا نام ”خطبات“ ہے۔ ترجمان ڈاک کی گڑبڑ اور کچھ اپنی اشاعت کی بے قاعدگی کی وجہ سے بہت دیر بعد ملا کر تھا۔ جس پرچہ میں یہ سارے مضامین تھے وہ مجھے نہیں ملا تھا جب ملے تو ایک ہی دن میں پڑھ ڈالا اور جہاد کے خطبے پڑھنے کے بعد فیصلہ کر لیا کہ مجھے اسکول چھوڑ دینا ہے۔ سن ۴۵ء میں اس کو چھوڑ دیا اور پانچ ماہ بعد جماعت میں داخل ہو گئی۔

مضمون نگاری: مضمون نگاری کا مجھے شروع سے کوئی شوق نہ تھا۔ بچپن میں ایک حدیث پڑھی تھی کہ جو لوگ دوسروں کو اچھی باتیں بتاتے ہیں اور خود ان پر عمل نہیں کرتے ان کے ہونٹ آگ کی فینچی سے کاٹے جائیں گے۔ اسی لئے تقریر اور تحریر دونوں سے پرہیز کیا۔ کچھ یہ بھی خیال تھا کہ مضامین لکھنے والے بہت ہیں عمل کرنے والوں کی کمی ہے۔ میں اس کمی کو پورا کروں گی۔ تعلیم و تعلم کے دوران جب بھی کسی نے ادھر متوجہ کیا ہمیشہ یہی عذر پیش کیا کہ خدا مجھے اپنا مخلص بندہ بننے کی توفیق دے۔ مضمون نگاری ایک اپنی عائد کردہ ذمہ داری ہوگی۔

لکھنے کی ابتدا: جب جماعت کے طریق کار سے واقف ہوئی تو معلوم ہوا کہ نیت درست ہو تو تقریر و تحریر بھی ثواب کے کام ہیں بلکہ

ضروری ہیں۔ غلط تقریریں اور تحریریں بھی لوگوں کو گمراہ کر رہی ہیں۔ تاہم اس کو اتنا ضروری کبھی نہیں سمجھا کہ اس کی مشق کروں۔ اسلام کے تعارف نے فرائض کے انبار سامنے رکھ دیئے ہیں۔ ان کی ادائیگی کا احساس ہر وقت بے چین رکھتا ہے اور اب تک اطمینان سے کچھ نہیں لکھ سکتی۔ ۴۷ء میں پہلی دفعہ ”الحسنات“ رام پور کیلئے چند چیزیں لکھیں اس کے بعد کبھی کبھار کچھ لکھتی رہی۔ لیکن ہمیشہ اُس وقت جب ضرورت شدید محسوس کی۔ زیادہ تر مضامین بچوں اور خواتین کے رسائل میں آئے ہیں اور کبھی روزناموں میں بھی۔ تفصیل یہ ہے۔

تسلیم، کوثر، نوائے وقت، قذیل، چٹان، آفاق، الحسنات، نور، فردوس، جہانِ نو، پھول، ہدایت، مسلمہ، عصمت وغیرہ۔ پھول اور قذیل میں نسبتاً زیادہ مضامین آئے ”اسماء“ کے نام پر۔ جماعتی پرچوں میں اصلی نام سے لکھتی رہی۔

عفت کا اجراء: مدت سے خواتین کے ایک ایسے رسالے کی ضرورت محسوس کی جاتی تھی جو مسلمان خواتین کی مکمل رہنمائی کرے۔ خدا کا شکر ہے کہ یہ خواب جولائی ۵۵ء میں سچا ہوا اور عفت بہن بھائیوں کے ہاتھ میں پہنچ گیا۔ یہ رسالہ کیسا ہے اس کا فیصلہ قارئین ہی کریں گے۔ اب تک اس کو جو کامیابی ہوئی وہ خدا کا خاص فضل و احسان ہے۔ میں اس کی ایڈیٹر بننے کی ہرگز اہل نہیں ہوں۔ اللہ تعالیٰ کسی قابل بہن کو یہ کام سنبھالنے کی توفیق عطا کرے اور میں اس کڑی ذمہ داری سے سبکدوش ہو جاؤں۔

رسالے کو جو کچھ ہونا چاہیے وہ نہیں ہے تاہم ایک ہی سال کے اندر اندر مقبول ہو گیا ہے اور ہر طرف سے تعریفی خطوط مل رہے ہیں۔ خدا کرے کہ ہم اپنے مقصد میں کامیاب ہوں اور اس بارگاہ سے شرف قبولیت حاصل کریں جس کی رضا جوئی ہمارا نصب العین ہے۔ سنا ہے لوگ اس سے متاثر ہو رہے ہیں۔ واللہ اعلم۔

☆.....☆.....☆

آکاش سے پرے

فلاجی ریاست کا تصور

ایک ریسرچ کے مطابق پاکستان فلاجی کاموں میں دنیا کے دیگر ممالک کی نسبت سرفہرست ہے اور حقیقتاً پاکستان کی بقا کا معجزہ بھی ایسے فلاجی کام کرنے والوں کے سر ہی جاتا ہے ورنہ اسمبلی میں بیٹھنے والوں کی نظر تو اپنی فلاح سے آگے جاتی ہی نہیں وہ صرف اپنے مفاد کے بارے میں سوچتے ہیں، عوام کے بارے میں سوچنے کی انہیں فرصت نہیں۔

افسوس اس بات کا ہے کہ اتنا فلاجی کام کرنے کے باوجود معاشرے میں ترقی اور خوشحالی نظر نہیں آتی۔ نہ بھوک میں کمی آتی ہے نہ افلاس میں۔ وجہ حکومت کی عدم سرپرستی اور فلاجی اداروں میں نظم و ضبط کی کمی ہے۔

اسلام میں جب بھی ہمیں کسی فلاجی ریاست کا تصور حاصل کرنا ہو تو ہمیں حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے دور کی طرف رجوع کرنا پڑتا ہے۔ لیکن امریکہ میں قدم قدم پر حضرت عمرؓ کے فلاجی ماڈل کا عملی اظہار نظر آتا ہے۔ یتیم، بیوہ، بیمار، معذور، غریب، مسکین ہر ایک کے حقوق اسے باسانی ملتے نظر آتے ہیں۔

سوشل سیکیورٹی کی صورت میں بڑھاپے کو تحفظ فراہم کیا جاتا ہے۔ غریب انسان Food Stamps حاصل کر کے کسی جگہ سے بھی کھانا حاصل کر سکتا ہے۔ بے روزگاروں کو الائنس ملتا ہے تو بیوہ عورت بے فکری سے اپنی اور اپنے بچوں کی ضروریات پوری کر سکتی ہے۔

کیونٹی کے لئے بے لوث کام کرنا ہر ایک کے لئے ضروری ہے۔ نوجوان طالب علموں کو اس Community Work پر اضافی نمبر بھی ملتے ہیں۔ ہر ادارے کو سال کے آخر میں یہ بتانا ضروری ہے کہ انہوں نے ضرورت مندوں کی مدد کس طرح کی۔

ماموں فاروق ایک بینک سے منسلک ہیں۔ بینک نے ایک سال ان بوڑھے، معذور لوگوں کی مدد کرنے کا پلان بنایا جو عرصہ دراز سے اپنے گھر میں کوئی تبدیلی نہ لاسکے اور ان ہی بوسیدہ گھروں میں رہنے پر مجبور ہیں۔ مقررہ دن بینک کا تمام عملہ ان کے گھروں میں پہنچ گیا۔ انہیں متبادل مقام پر منتقل کیا گیا۔ ان کے گھر کی دیواریں پینٹ کی گئیں، بوسیدہ فرنیچر تبدیل کیا گیا۔ سارے گھر کی صفائی کی گئی غرض شام تک گھر کا نقشہ بدل دیا گیا یہاں تک کہ راہداری کو بھی پھولوں سے سجا دیا گیا تاکہ صاحب خانہ پر مسرت انداز سے اپنے گھر میں داخل ہو۔ شام کو جب یہ بوڑھے اور معذور لوگ اپنے گھروں میں واپس لوٹے ہوں گے تو ان کے چہرے کی خوشی آپ محسوس کر سکتے ہیں۔

بچوں میں آغاز ہی سے کمیونٹی ورک کی اہمیت بہت اجاگر کی جاتی ہے لہذا ہر کوئی اپنے آپ کو کسی کام سے ضرور منسلک رکھتا ہے اور اس میں فخر محسوس کرتا ہے۔

اولیں کمیونٹی سروس کے لئے ایک ایسبولینس سے منسلک تھا جس روز اس کی ڈیوٹی ہوتی تمام وقت یونین فارم پہننے ایک مجاہد کی طرح الرٹ رہتا۔ ایمر جنسی کال پر وہ ہر کام چھوڑ کر اٹھ جاتا اور پانچ منٹ کے اندر اپنی ڈیوٹی پر جا پہنچتا یہ وہ فلاجی معاشرہ ہے جس کا تصور ہمیں اسلام دیتا ہے لیکن اس کا عملی اظہار دیکھنے کے لئے ہمیں غیر قوموں کی طرف رجوع کرنا پڑتا ہے۔ افسوس صد افسوس، نجانے ہمارا یہ خواب کب شرمندہ تعبیر ہوگا۔

ایک فلاجی معاشرے میں کمزور اور مظلوموں کے حقوق کا تحفظ کیا جاتا ہے۔ اس حوالے سے مجھے اس معاشرے کی عورت بہت طاقتور نظر آئی۔ کوئی مرد اپنی بیوی کی بے جا تذلیل نہیں کر سکتا اور گھر میں چیخ و پکار

احساس ہوتا کہ جب تک ہمارے بچے اپنے والدین کے حقوق سے غافل نہیں ہوتے تب تک ہمارا معاشرہ زندہ رہے گا۔

اس معاشرے میں اولڈ ہومز کا کلچر دراصل مکافات عمل ہے۔ بچپن میں بچہ ادارے کے حوالے اور پھر اٹھارہ سال کی عمر میں والدین اس کی ہر ذمہ داری سے ہاتھ اٹھا لیتے ہیں۔ بچے کو اپنے لئے خود چھت ڈھونڈنی پڑتی ہے، روزی کا چارہ کرنا پڑتا ہے، اب اگر والدین اس کی کوئی مدد کریں گے بھی تو یہ قرض ہوگا جو اس بچے کو واپس لوٹانا ہوگا..... یہی وجوہات ہیں کہ نوجوان نسل میں Anxiety اور Depression کی علامات بہت زیادہ ہیں۔ جب والدین اٹھارہ سال کی عمر میں بچے کو بے درکردیتے ہیں تو انقائاً بچے بھی بڑھاپے میں ان سے منہ موڑ لیتے ہیں۔ مشرقی معاشرے کا یہ خُسن ہے کہ جوانی کی تنگ میں بچہ منہ زور گھوڑے کی طرح رسہ تڑا بھی لے مگر پھر پلٹ کر واپس ماں باپ کی طرف ضرور آتا ہے۔ اس لئے کہ ان والدین نے تمام زندگی بچے کیلئے قربانیاں دی ہوتی ہیں۔ Quality time کے علاوہ quantity time بھی دیا ہوتا ہے۔

Bridal Shower اور Baby Shower

شادی بیاہ کے رسم و رواج وہاں کے پاکستانیوں نے بہت بڑھا لئے ہیں اس لئے کہ اپنے کلچر کی تمام رسوم بھی کرنی ہیں اور مغربی معاشرے کی رسموں کو بھی اب اپنا لیا ہے۔ لہذا ایک طویل عرصہ لگتا ہے نکاح کی رسم تک پہنچنے کے لئے۔ ہر ویک اینڈ پر ایک فنکشن ہوگا Bridal shower، پھر قرآن خوانی، مانیوں، ڈھولک، مہندی ان کے علاوہ بھی رونق لگانے کے بہانے ڈھونڈے جاسکتے ہیں۔

بہر حال بات ان دو فنکشنوں کی ہو رہی ہے۔ بچے کی پیدائش سے پہلے Baby Shower کی پارٹی ہوگی اور یہ کئی مرتبہ ہو سکتی ہے کبھی نوجوانوں کی پارٹی ہے تو کبھی بوڑھے والدین اپنے شوق پورے کر رہے ہیں۔ پہلے تو میں نے انہیں عیسائی رسم و رواج بتا کر کوشش کی کہ لوگ غیر ضروری رسموں کو نہ اپنائیں لیکن وہاں سب لوگ ذہنی طور پر انہیں اپنا چکے ہیں لہذا سب نے میرے دلائل رد کر دیئے اور واضح اعلان کر دیا کہ یہ

نہیں کر سکتا۔ اس شور، ہنگامے کی خبر اگر ہمسائے بھی دے دیں تو پولیس فوراً پہنچ جائے گی اور مرد کو گرفتار کر لے گی۔ اس لئے بھی مرمقراط زبان استعمال کرتے ہیں۔ ویسے اس معاشرے میں ریٹائرڈ بوڑھے زیادہ تر ”خکا بیتی ٹو“ کا کردار ادا کرتے ہیں اور سارا دن نظر رکھتے ہیں کہ کہیں کچھ غلط تو نہیں ہو رہا، فوراً پولیس کو اطلاع کرتے ہیں۔

جو بویا ہے سو کاٹو گے

امریکی معاشرے میں ہر نوجوان اپنے کیریئر کے لئے بہت سنجیدہ ہے اور جوانی کو ان تھک محنت اور تنگ و دو میں گزارتا ہے۔ مرد اور عورت دونوں ہی اس دوڑ میں برابر کے حصہ دار ہیں لہذا بچوں کی پرورش کے لئے وقت نکالنا مشکل ہو جاتا ہے۔ آسان ترین راستہ یہ ہے کہ انہیں ڈے کیئر میں چھوڑ دیا جائے اور شام کو تھکی ہاری ماں باپ بچے کو واپس وصول کریں اور گھر آجائیں۔ یہ تو نہیں کہہ سکتی کہ ماں باپ اپنی اولاد سے محبت نہیں کرتے لیکن مادیت کے اس دور میں ان کے پاس بچے کیلئے وقت نہیں ہے جواب میں وہ یہ کہتے ہیں کہ ہم Quality of time دیکھتے ہیں Quantity of time نہیں۔

اسی طرح چلتے ہوئے بچہ جوان ہو جاتا ہے اور وہ والدین بوڑھے ہو جاتے ہیں۔ اب ان والدین کی خدمت یہ ہے کہ انہیں کسی بہترین اولڈ ہوم میں بھجوا دیا جائے اور Quality of time یہ ہے کہ جب کبھی فرصت ملے تو ایک عدد پھولوں کا گلدستہ لے کر ماں باپ کے گالوں پر بوسہ دینے چلے جاؤ۔

مجھے وہاں کے بوڑھوں میں عجیب وحشت اور خوف نظر آیا۔ عمر کی پونجی وہ صرف کر چکے ہوتے ہیں۔ اگلی زندگی کے لئے کوئی واضح لائحہ عمل نہیں۔ بچے اپنی تیز رفتار زندگی میں گم ہیں۔ اس مقام پر مشرقی معاشرے کی اقدار بہت بہتر نظر آتی ہیں۔

میں اپنے شاگردوں سے اکثر یہ سوال کیا کرتی تھی کہ کیا برائی ہے اگر ہم اپنے معاشرے میں بھی اولڈ ہومز شروع کر دیں جہاں ہمارے والدین آرام سے رہیں۔ مگر ہر بچے کا ایک ہی جواب ہوتا تھا کہ ہم اپنے والدین کی خود خدمت کریں گے۔ تب مجھے ایک انجانی سی خوشی کا

یہودیوں یا عیسائیوں کی رسوم نہیں ہیں صرف مل بیٹھے اور خوش ہونے کا ذریعہ ہیں۔

بچے کی پیدائش پر یا شادی بیاہ میں لین دین کا طریقہ کار بھی بہت مختلف ہے۔ ایسے مواقع پر بچے کے والدین یا دولہا، دلہن کسی Shop پر رجسٹری کرا لیتے ہیں اور اپنی ضرورت کی اشیاء کی لسٹ فراہم کر دیتے ہیں۔ تمام احباب کو بتا دیا جاتا ہے کہ ہم نے فلاں جگہ کی رجسٹری کرائی ہے، آپ گھر بیٹھے وہاں سے لسٹ میں فراہم کردہ اشیاء خرید لیں۔ وہ خود بخود آپ کے نام سے صاحب خانہ کو پہنچ جائیں گی۔ ایک چیز خرید لی گئی تو دوسرا وہ نہیں خریدے گا اسی طرح ایک جیسے تحائف جمع ہونے کا امکان نہیں۔ لہذا بچے کی پیدائش سے پہلے ضرورت کی اشیاء Baby Shower پر والدین کے پاس پہنچ جاتی ہیں اور شادی شدہ جوڑے کو بھی گھر بنانے کے لئے جس سامان کی ضرورت ہے وہ Bridal Shower پر ان کے پاس پہنچ جاتا ہے۔ بے ضرورت تحائف کا ڈھیر نہیں لگ جاتا اور ایک ہی تحفہ نانی، چچا، خالہ کی طرف سے نہیں آ جاتا۔

اب فیصلہ آپ کا ہے کہ لین دین کا جدید نظام آپ کو پسند ہے یا اپنا وہی سسٹم کہ ایک سرپرائز ہوتا ہے کہ اس خوبصورت بنڈل کے اندر بھی اتنی ہی خوبصورت چیز ہے یا.....؟

BRONZ ZOO

یقیناً آپ سوچ رہے ہوں گے کہ میں آپ کو چڑیا گھر کے مناظر دکھاؤں گی اور طرح طرح کے جانوروں سے روشناس کراؤں گی لیکن میری توجہ تو مکمل طور پر ان یہودی فیملیز کی طرف تھی جو آج بھی سمجھتے ہیں کہ ان کو اللہ تعالیٰ نے جہان والوں پر فضیلت دے رکھی ہے۔ ترکی سے امریکہ کیلئے جہاز میں سوار ہونے تو یہ عجیب و غریب حلیے کا شخص اس وقت بھی میری توجہ کا مرکز تھا۔ لمبا کوٹ پہنے، سر پر ایک کالی چھوٹی سی ٹوپی جمائے، چہرے کے دونوں طرف لمبی لمبی بالوں کی زلفیں لٹکائے یہ سرخ و سفید شخص کوئی سات، آٹھ بچوں کے ہمراہ تھا اور اپنی فیملی کے لئے بہترین اور آرام دہ جگہ کی تگ و دو کر رہا تھا۔ اسی طرح کی بہت سی یہودی فیملیز یہاں نظر آ رہی تھیں۔ ان کی بیگمات نہایت نفیس لباس سے

آراستہ، عام لوگوں سے مختلف کسی اور دنیا کی مخلوق لگتی تھیں۔ مجھے منع کر دیا گیا کہ ان کی طرف نگاہ نہ دیکھوں، اس بات کو معیوب سمجھا جاتا ہے۔

یہودی النسل ہونا ان کے لئے بہت فخر کی بات ہے چونکہ کوئی شخص مذہب تبدیل کر کے یہودی نہیں بن سکتا اس لئے یہ اپنی نسل کی پرداخت کے لئے بہت حساس ہیں۔ کثرتِ اولاد ان میں باعثِ تفاخر ہے۔ زیادہ بچے پیدا کرنے والی عورت کو ان میں بہت عزت کی نظر سے دیکھا جاتا ہے اور محفلوں میں بھی اسے دوسری عورتوں سے زیادہ معزز سمجھا جاتا ہے۔ اپنے بچوں کی تربیت کے لئے یہودی بہت زیادہ محتاط ہوتے ہیں اور اپنی فیملی سے محبت ان کا مذہبی فریضہ ہے۔

چونکہ یہ تفریح گاہ بچوں کے لئے ہی زیادہ دلچسپی کا باعث ہے اس لئے ہر عمر کے بچے یہاں جانوروں سے خوب لطف اندوز ہوتے نظر آتے ہیں۔ انتظامیہ نے والدین کی تکلیف کا احساس کرتے ہوئے بہت سی بچہ گاڑیاں شروع میں ہی رکھ دی ہیں۔ ہر کوئی اپنی سہولت اور بچوں کی تعداد کے مطابق ان کا انتخاب کرتا ہے اور فری اس سہولت سے فائدہ اٹھاتا ہے۔ یہ عوام کے ساتھ تعاون کا ایک معمولی سا منظر ہے۔

اتنے بڑے Zoo میں خدا کی قدرت کا شاہکار طرح طرح کے جانور، پرندے، سانپ موجود تھے۔ خطرناک جنگلی جانور اپنے قدرتی ماحول میں ہی رکھے گئے تھے وہ پنجروں میں قید نظر نہیں آئے مجھے سب سے زیادہ دلچسپی شاہین (EAGLE) کو دیکھنے میں محسوس ہوئی۔ میں نے پہلی مرتبہ شاہین کو اتنے غور سے اور اتنے قریب سے دیکھا۔ تب مجھے احساس ہوا کہ اقبال نے شاہین کو اتنی اہمیت کیوں دی۔ اس کے چہرے کا رعب، تمکنت، اس کا وقار بلاشبہ اسے دیگر پرندوں سے ممتاز کرتا تھا۔ اس کی شخصیت میں وہ تمام خوبیاں نظر آ رہی تھیں جن کی بنا پر علامہ اقبال مسلم نوجوانوں کو شاہین بننے کی ترغیب دیتے ہیں۔

برابر کے پنجرے میں آلو تھا جو کہ امریکیوں کے لئے عقل و حکمت کی علامت ہے۔ لیکن مجھے تو وہ شکل سے ہی آلو لگ رہا تھا یا پھر سوچ کا تعصب ہے کہ ہم نے آلو کو ہمیشہ ایک احمق پرندہ ہی سمجھا اس لئے ہمیں

وہ ہزارویں سے احمق ہی لگ رہا تھا۔

بہر حال خدا کی قدرت کے ایسے ایسے شاہکار نظر آئے کہ بیساختہ انسان سبحان اللہ کہہ اٹھتا ہے۔

ہر معاشرے کی زبان بھی وہاں کے جانوروں کی شخصیت سے متاثر ہوتی ہے۔ آپ پاکستان میں کسی کو ’سُور‘ کہہ دیں اس کے تن بدن میں آگ لگ جائے گی جبکہ وہاں ایک امریکی اسے باعث اعزاز سمجھے گا۔ سلکنک (SCUNK) وہاں ایک بدبودار نیولے کی طرح کا جانور ہے جو جہاں سے گزر جائے وہ علاقہ بدبو سے مہک اٹھتا ہے اور لوگ اس کی بدبو سے انتہائی بد مزہ ہوتے ہیں۔ کسی امریکی کو آپ گٹا یا سُور کہہ دیں وہ ناراض نہیں ہوگا مسکراتا رہے گا لیکن اگر آپ اُسے SCUNK کہہ دیں تو غصے سے اس کے تیور بدل جائیں گے اور وہ اس میں اپنی بہت تذلیل محسوس کرے گا۔

آمش سوسائٹی

پتھر کے زمانے میں واپس بھیج دینے کی دھمکی جب امریکہ نے پاکستان کو دی تو پاکستانی حکمرانوں کے ہاتھ پاؤں پھول گئے اور صرف پتھر کے زمانے میں واپس جانے سے بچنے کے لئے انہوں نے اپنی تمام اقدار داؤ پر لگا دیں اور خود کو پوری طرح امریکیوں کے حوالے کر دیا۔ حیرت ناک بات یہ ہے کہ آج کے ترقی یافتہ دور میں عین امریکیوں کی جگہ لگاتی تہذیب کے ساتھ ایک سوسائٹی ایسی بھی ہے جو آج بھی اپنی پرانی اقدار سے وابستہ ہے اور امریکہ میں رہتے ہوئے بھی وہ جدید ترقی سے خود کو جدا رکھتے ہیں۔ چند گھنٹے بجلی کا نہ ہونا ہمارے صبر پر گراں گزرتا ہے لیکن یہ قوم بجلی اور بجلی سے چلنے والی تمام اشیا کو مذہبی طور پر اپنے اوپر حرام سمجھتی ہے۔ یہ ہے (AMISH SOCIETY) جی ہاں اگر امریکہ کی سٹیٹ پنسلوینیا میں آپ کی ملاقات اس قوم سے ہو جائے تو آپ یہ دیکھ کر حیران رہ جائیں گے کہ پتھر کا زمانہ اتنا برا نہیں۔ بلکہ جس سکون، سادگی اور حیا سے جدید زمانے نے آپ کو محروم کر دیا ہے یہ سب بڑے سکون سے جدید ترقی کے بغیر زندگی گزار رہے ہیں۔

ریاست پنسلوینیا میں داخل ہوتے ہی حد نگاہ تک پھیلے ہوئے

ہرے بھرے کھیتوں نے طبیعت کو شاداب کر دیا۔ سڑک کے کنارے چلتی گھوڑوں کی بگھی کو دیکھ کر سب اچھل پڑے۔ وہ دیکھو آمش لوگ! اور پھر تھوڑے فاصلے پر چلتی ہوئی خواتین نے ہماری توجہ کھینچ لی۔ سر سے پاؤں تک ایک لمبے فرائٹ نمال لباس میں ملبوس خواتین۔ سر کو سکارف سے ڈھانکے حیا اور وقار کے ساتھ سڑک کے کنارے کنارے چل رہی تھیں۔ یہ تو ہم ایک نئی دنیا میں آگئے تھے۔ سرسبز و شاداب کھیتوں کے درمیان ایک تین کمروں پر مشتمل رہائش ہماری منتظر تھی۔ آمش تہذیب سے متعارف کرانے کے لئے ایک فلم وہاں موجود تھی۔ خود تو وہ بجلی کا استعمال نہیں کرتے لیکن ہمارے لئے تمام سہولتیں میسر تھیں۔ اب ہمیں ان کی تہذیب کو جاننے میں بہت دلچسپی ہوگئی۔ شام کو ان کے علاقوں سے گزر کر دیکھا تو کسی کسی گھر سے ہلکی ٹھٹھاتی لونظر آتی تھی۔ یہ وہ گیس لیمپ کی روشنی تھی جو یہ گھروں کو روشن رکھنے کے لئے جلاتے ہیں۔ اسی طرح گیس سے جوازرجی حاصل کر سکیں اس سے ضرورت پوری کر لیتے ہیں مگر بجلی سے گریز کرتے ہیں۔ اس لئے ٹی وی، موبائل، میٹ پ تمام سہولیات انہیں میسر نہیں ہیں یا وہ خود انہیں اپنی زندگی کا حصہ نہیں بناتے۔ بجلی کی مصنوعات سے گریز نے انہیں معاشرے سے الگ کر دیا ہے۔

پرانے وقتوں کے ہینڈ پمپ جن سے پانی نکالا جاتا تھا، شاید آج کی نسل کو اس کا تصور بھی نہ ہو لیکن وہ بھی وہاں نظر آئے گویا زمین سے پانی اسی پرانے طریقے سے بھی نکالا جاتا ہے۔ کپڑے پرانے روایتی انداز سے دھوئے جاتے ہیں اور مشینوں پر انحصار نہیں کیا جاتا لمبی لمبی رسیوں پر کپڑے ڈال کر سکھائے جاتے ہیں۔

آپ کے ذہن میں پاکستان کے کسی گاؤں کا نقشہ ابھر رہا ہوگا لیکن تہذیب اور شائستگی انتہا کی ہے۔ صفائی کا نظام بہت عمدہ ہے جدید تعلیم سے بیزار ہیں لیکن بہر حال تعلیم کا اپنا نظام ہے جس نے اس تہذیب کو سنبھالا ہوا ہے۔

مرد گہرے رنگ کے لباس زیب تن کرتے ہیں جو ایک لمبے کوٹ اور ٹراؤزر پر مشتمل ہوتا ہے اور سر پر پرانے سٹائل کا ہیٹ ہوتا ہے۔

عورتیں پوری آستین کا فراک نمالباس پہنتی ہیں جو پاؤں تک لمبا ہوتا ہے اور سر کو سکارف سے ڈھانپتی ہیں۔ عورتیں بال نہیں کٹواتیں بلکہ ایک جوڑے کی طرح انہیں سکارف میں چھپالیتی ہیں۔ آئمش عورتیں جیولری نہیں پہنتیں اور نہ ہی رنگارنگ پھول دار لباس زیب تن کرتی ہیں۔ عام عورت سفید سکارف سے اپنا سر ڈھانپتی ہے لیکن اگر چرچ میں مذہبی رسومات ہوں تو ان کے لئے سیاہ سکارف استعمال کیا جاتا ہے۔ گھروں میں اور چرچ میں مذہبی رسومات کے لئے جرمن زبان کا استعمال کیا جاتا ہے لیکن اسکول میں انگریزی سیکھی جاتی ہے۔ چرچ کو ان کی زندگی میں مرکزی اہمیت حاصل ہے۔ مذہبی تعلیمات بائبل سے ماخوذ ہیں۔

فیملی ان کے معاشرے میں بہت اہمیت رکھتی ہے۔ عورتیں نوکری نہیں کرتیں وہ گھر بار سنبھالنے پر زیادہ توجہ دیتی ہیں کیونکہ ہر کام انہیں خود ہاتھوں سے کرنا ہوتا ہے مشینوں پر انحصار نہیں ہے۔ مرد جفاکش اور سختی ہیں۔ باہر کے تمام کام جفاکشی سے انجام دیتے ہیں بلکہ نو عمر لڑکے بھی ان کا ہاتھ بٹاتے نظر آتے ہیں۔ مختصر فیملی کا ان میں تصور نہیں ہے۔ سات سے دس بچے ان کے لئے معمولی بات ہے اگر دو چار بچے جدید دنیا میں جانا بھی چاہیں تب بھی تین چار بچوں کو تو ضرور یہ چرچ کی خدمت کے لئے وقف کر لیتے ہیں۔

بزرگوں کو اس معاشرے میں بہت عزت اور احترام کی نظر سے دیکھا جاتا ہے۔ بوڑھے ہو جانے پر بھی ان کی غیرت حکومت سے سوشل سکیورٹی لینا گوارا نہیں کرتی اور بچے اپنے بزرگوں کو اولڈ ہومز میں داخل نہیں کرتے بلکہ گھر میں رکھ کر ہی ان کی خدمت کرتے ہیں۔

آئمش معاشرے میں اپنی ذاتی گاڑی رکھنے کا کوئی تصور نہیں ہے۔ چرچ ٹرین اور بس میں سفر کی اجازت دیتا ہے لیکن جہاز میں سفر کرنا ان کے لئے آج بھی ممنوع ہے۔

ذاتی استعمال کے لئے گھوڑا گاڑی یا سائیکل استعمال کی جاسکتی ہے گھروں سے دور سینما یا بڑے مال پر جانے کی بجائے آئمش بچے اپنے گھروں کے ساتھ منسلک کھیتوں میں کھیل کود کا اہتمام کرتے ہیں اسکول میں بیس بال ان کی پسندیدہ گیم ہے۔

کچھ نوجوان جوانی کے زعم میں اپنی روایات سے باغی بھی ہو جاتے ہیں۔ یہ نوجوان گاڑی چلانے کا شوق رکھتے ہیں۔ پارٹیوں میں جانا، فلمیں دیکھنا، مال پر گھومنا پھرنا جب انہیں اچھا لگتا ہے تو بغاوت کے آثار دیکھ کر چرچ انہیں موقع دیتا ہے کہ باہر کی دنیا کو اچھی طرح پرکھ لیں پھر اگر یکسو ہو کر چرچ سے وابستہ ہونا چاہیں تو یہ سوسائٹی انہیں قبول کر لیتی ہے ورنہ بہت سے نوجوان جدید دنیا میں کھو جاتے ہیں۔

ماڈرن دنیا سے الگ تھلگ رہنے کے باوجود یہ معاشی طور پر خود کفیل ہوتے ہیں۔ اپنی ضروریات اپنی سوسائٹی کے اندر ہی پوری کر لیتے ہیں یہ حکومت کو ٹیکس بھی دیتے ہیں ان کا اپنا بینک کا نظام بھی ہے۔ حکومت انہیں وہ تمام سہولیات مہیا کرتی ہے جو دوسرے امریکیوں کو حاصل ہیں لیکن یہ خود سوشل سکیورٹی، بے روزگاری الاؤنس یا فلاجی چیک لینے سے گریز کرتے ہیں۔

مشکل وقت میں چرچ ہر شخص کی مدد کرتا ہے۔ بیماری، بے روزگاری، معاشی تنگی سب حالات میں چرچ سے رجوع کیا جاتا ہے۔ یہاں مجھے الیکٹرونکس یا موبائل کی بڑی بڑی دکانیں نظر نہیں آئیں یہ سب بالکل ANTIQUE SHOP چلاتے ہیں عورتیں گھر میں سلامتی کڑھائی کا مختلف سامان تیار کرتی ہیں۔ بستروں کی چادریں ہماری سندھی عورتوں کی بنائی ہوئی ”رٹی“ سے بہت ملتی ہیں جس میں چھوٹے چھوٹے کپڑے کاٹ کر مختلف ڈیزائن سے جوڑے جاتے ہیں۔

ایک بڑی عمر کی خاتون جیولری فروخت کر رہی تھیں جو موتیوں سے بنائی گئی تھی۔ ہم نے ان سے پوچھا کہ یہ انہوں نے خود بنائی ہے؟ اس خاتون نے جواب دیا کہ یہ میری والدہ نے بنائی ہے اور وہ گھریٹھ کر یہ کام کرتی ہیں۔ ہم حیرت سے اس عمر رسیدہ خاتون کو دیکھ رہے تھے اور پھر ان کی والدہ کی عمر کا اندازہ لگانے کی کوشش کر رہے تھے۔

تصویر بنوانا مذہبی طور پر پسند نہیں کرتے۔ ایک گھوڑا گاڑی کی جب ہم نے تصویر لینا چاہی تو گاڑی بان دوسری طرف منہ کر کے کھڑا ہو گیا۔

سادگی، سکون اور حیا کا مرقع یہ سوسائٹی اس بات کی غماز ہے کہ

زندگی بسر کرنے کے لئے جدید سہولیات ضروری نہیں۔ آج ہم اپنے بچوں کو جدید تہذیب کے حوالے یہ کہہ کر کر دیتے ہیں کہ زمانے سے پیچھے نہ رہ جائیں لیکن یہاں یہ سبق ہے کہ زمانہ ہم خود ہیں۔ آتش معاشرے میں ہمارے لئے یہ سبق ہے ہر بات میں مغرب کی تقلید ہی میں ترقی کا راز پوشیدہ نہیں ہے۔ اصل انسان اپنی مذہبی روایات اور اخلاقیات سے بنتا ہے۔

پاکستان واپس آنے کے بعد اصل ڈپریشن یہاں گندگی کے ڈھیر دیکھ کر ہوتا ہے۔ اپنے اوپر بیٹھنے والی مکھی کو اڑانے کے لئے آپ کو کس ٹیکنالوجی کی ضرورت ہے یہ تو آپ نے خود ہی اڑانی ہے اچھی مسکراہٹ چہرے پر لانے اور خوبصورت بات کرنے کے لئے کس جدید ٹیکنالوجی کی ضرورت ہے؟ یہ تو میرے ہی اختیار میں ہے کہ اس زبان سے شعلے بھی برس سکتی ہوں اور پھولوں کی طرح مہکتی بات بھی کر سکتی ہوں۔ ہماری قوم کی پس ماندگی کا مسئلہ جدید ٹیکنالوجی نہیں ہے اپنی مذہبی اور ثقافتی روایات سے انحراف ہے۔ ہماری ترقی کی راہ میں رکاوٹ صرف بنیادی ضروریات کا فقدان ہی نہیں، اخلاقی انحطاط بھی ہے۔

وطن واپسی پر جب گاڑی کسی چوک پر رکتی ہے اور چاروں طرف مانگنے والے گاڑی کو گھیر لیتے ہیں تو دل غم سے بھر جاتا ہے۔ یہ لوگ وہاں کیوں نظر نہیں آئے، اس لئے کہ انہوں نے کشکول توڑ دیا ہے اور ہم نے مانگنے کو آسان کر لیا ہے۔ ہم انسانی صلاحیتوں کو کتنی آسانی سے ضائع کر دیتے ہیں۔ یہ لوگ جو صبح سے شام تک اتنی محنت اور مشقت سے مانگتے ہیں یہ کسی کام کے ذریعے اس ملک کی ترقی کا زینہ بھی تو بن سکتے ہیں۔ کاش ہمارے حکمران جاگ جائیں اور انسانی ہنر کو استعمال کرنے کے فن سے واقف ہو جائیں!

ختم شد

☆.....☆.....☆

کور یڈور

اسی کشمکش میں وقت گزرتا گیا۔ نئے تعلیمی سال کے آغاز میں نئے داخلے ہوئے۔ اب کور یڈور میں نئے چہرے نظر آنے لگے۔ ایک دن اس میں بھوری سی داڑھی والے ایک نئے فرد کو دیکھا۔ بعد میں پتہ چلا کہ وہ ہماری کلاس کے... بھائی ہیں۔ ان کو وہاں دیکھ کر بڑی مایوسی ہوئی۔ کچھ اچھا نہ لگا کہ وہ بھی اس قسم کے مشاغل میں شامل ہوں! لیکن آہستہ آہستہ یہاں کا رنگ بدلنے لگا۔ شوخی تو وہی رہی، ہاں کانوں میں پڑنے والے فقروں کا رنگ، لہجہ اور الفاظ تبدیل ہوتے ہوئے محسوس ہونے لگے۔

اور ایک دن ان طلبہ میں سے ایک کے ہاتھ میں ”پردہ“ نامی کتاب دیکھی۔ بڑا تجسس محسوس ہوا اور اس سے زیادہ حیران کن وہ مکالمے:

”کیا اس کو پردہ کر پردہ کرنے کا ارادہ ہے؟“ لہجے میں تمسخر اور شوخی نمایاں تھی۔

”نہیں بھائی! اس کو پردہ کر میری آنکھوں کا پردہ ہٹ گیا.....“ یہ جملہ سماعت کے لیے بڑے بھلے سے لگے۔

میرے ہاتھ میں بھی یہ کتاب آئی مگر اس سے پہلے یا اسی کے دوران قرآن کو ترجمہ سے پڑھنے کی سعادت ملی۔ درجنوں بار پڑھی ہوئی آیات جب ترجمہ اور تفسیر کے ساتھ نظروں سے گزریں تو زاویہ نظر بدلا اور راستہ سمجھ آنے لگا۔۔۔ اور پھر میری آنکھوں سے بھی پردہ ہٹ گیا بلکہ اب مجھے تو ایک قدم آگے بڑھ کر اسے اپنے جسم کی زینت بنانا تھا۔ میری زندگی کا ایک خوشگوار دن جب میں نے اللہ کے دیے ہوئے تحفے کو قبول کر کے فطری سکون حاصل کیا!!

آج بھی طلبہ اور نوجوان کوری ڈورز میں بیٹھے ہوتے ہیں۔ بے مقصد اور لا پرواہ! بلکہ اب تو عالمی کوریڈور (سوشل میڈیا) میں بیٹھے شغل کر رہے ہوتے ہیں! کاش کوئی بھائی، بہن ان کے ہاتھ میں یہ کتاب پکڑا دے جو ان کی آنکھوں کے پردے بھی ہٹا دے!

☆.....☆.....☆

گزر لڑکالج سے انٹر کرنے کے بعد آنرز کے لیے جب یونیورسٹی میں داخلہ لیا تو ایک نئی دنیا تھی۔ حالانکہ آٹھویں جماعت تک لڑکوں کے ساتھ ہی پڑھا تھا مگر وہ بے چارے معصوم سے برادران جو پہلی جماعت سے ہمارے ساتھ پڑھتے چلے آ رہے تھے، ان کی تو ہمت نہ پڑی کہ کبھی پوزیشن لے سکیں کجا کہ کوئی جملہ بازی کریں۔ مگر جامعہ کے مخلوط ادارے میں آ کر انہیں کا آغاز ہوا جو جسمانی کے ساتھ ذہنی بھی تھی۔ میری اس بے چینی کا نام تھا کوریڈور!

جی ہاں! کوریڈور ہر بلڈنگ کا ایک لازمی حصہ ہوتے ہیں مگر تعلیمی ادارے میں اس کی اپنی الگ اہمیت ہے! انتظار کلاس کا ہو یا ٹیچر کا، ہر دو صورتوں میں یہ آباد رہتا ہے طلبہ نام کی مخلوق سے! اگر یہ کہا جائے کہ تعلیمی زندگی کا آدھا دور کوریڈور میں گزرتا ہے تو بے جا نہ ہوگا! میری بے چینی کی وجہ اس منڈیر کے ساتھ بیٹھے طلبہ کا گروپ ہوتا تھا۔ یہاں سے گزرتے ہوئے ان کے چلبلیہ جملے سننا کسی قدر عذاب سے کم نہ لگتا تھا۔

”.....سب آپ کو دیکھ رہے ہیں!“

”جی!!“ جس طالبہ سے یہ جملہ کہا گیا تھا وہ غصے سے پلٹ کر بولی

”...آپ کی قمیض کو دیکھ رہے ہیں.....!“ اس پردنیا کے ممالک کے جھنڈوں کی قصا و تہیں۔ بات قہقہہ میں اڑا دی گئی۔

کسی طالبہ نے پیلے یا خاکی رنگ کے کپڑے پہن لیے تو مایوں کے گیت گانے شروع کر دیے۔ کبھی کبھی بات پر لطف رہتی مگر اکثر بد مزگی پر ختم ہوتی اور طالبات خون کے گھونٹ پی کر رہ جاتیں۔ میری ایک کلاس فیلو کا کہنا تھا کہ اگر میرے ابا یہاں کا منظر دیکھ لیں تو مجھے اسی دن یونیورسٹی سے اٹھالیں گے! اس تمام ہونٹ پر کبھی کبھی بہت کوفت محسوس ہوتی تھی لیکن جب آج اس وقت کی طالبات کے حلیے اور لباس کو یاد کرتی ہوں تو پیشانی عرق آلود ہو جاتی ہے۔ ٹی جیز اور سینورینا کے اسٹائلش سوٹوں کے ساتھ جارحیت کے مہین دوپٹے بالوں اور جسم کی ستر پوشی سے عاجز تھے۔ اس وقت کا ٹرینڈ یہ ہی تھا۔ شکر خدا کہ لیب کوٹ تھوڑا سا رکاوٹ بن جاتا ہمارے دکھاوے میں مگر وہی کلاس فیلوز کے اصرار کہ کپڑوں کا ڈیزائن تو نظر آنا چاہیے۔

حجاب متنازع کیوں؟

ہونے کے بعد یہ تنازعہ اٹھ کھڑا ہوا کہ اسے اسکارف کے ساتھ حلف اٹھانے دیا جائے گا یا نہیں۔ برسلز کے مشہور عرب جریدے نے انتخاب سے قبل رکن پارلیمنٹ ماہ نور سے پوچھا اگر انہیں برسلز کی پارلیمنٹ میں اسکارف کے ساتھ داخلے کی اجازت نہیں ملی تو؟ اس پر رکن پارلیمنٹ نے اطمینان کے ساتھ کہا کہ وہ محض پارلیمنٹ کی وجہ سے اپنا اسکارف ہرگز نہیں اتاریں گی۔ ان کو نا اہل قرار دیدیا گیا اور نا اہل قرار دینے والوں کا موقف یہ تھا کہ وہ بلجیم کی ثقافت کو تباہ کرنا چاہتی ہیں اس لئے ان کو نمائندگی کا حق حاصل نہیں ہے۔

گزشتہ برس بین الاقوامی میڈیا نے اس خبر کو خوب اچھالا جب ایک کویتی طالبہ کو راستے میں تین افراد نے روک کر اس سے سوال کیا کہ ”وہ حجاب کیوں نہیں اختیار کرتی؟“ اس نے جواب دیا کہ وہ اپنی مرضی کی مالک ہے اس معاملے سے ان کا کیا تعلق؟ ان تینوں افراد نے طالبہ کو سخت زد و کوب کیا اس پر کویتی حکومتی حرکت میں آئی اور ساری دنیا کی خواتین کی حقوق کی علمبردار تنظیموں نے خوب شور مچایا کہ ”انہا پسندی“ کویتی خواتین کیلئے خطرہ بنتی چلی جا رہی ہے۔

یہ کیسا طرفہ تماشہ ہے کہ بین الاقوامی میڈیا کو اور خواتین کو حقوق کی علمبردار این جی اوز کو کویتی طالبہ کے ساتھ رویہ انہا پسندانہ نظر آتا ہے اور اس کے لئے مغربی میڈیا ایک شور برپا کر دیتا ہے لیکن انہیں بلجیم، ترکی، تیونس، ازبکستان، فرانس اور جرمنی میں پامال ہونے والے حقوق کہیں سے بھی ”انسانی حقوق“ نظر نہیں آتے۔ ہم بین الاقوامی برادری کے سامنے ”حجاب“ کو انسانی حق کے طور پر کیوں نہیں پیش کر سکتے؟

حجاب کو بنیاد پرستی، انہا پسندی اور دہشت گردی سے کیوں جوڑ دیا جاتا ہے؟ جب بھی حجاب کے ساتھ امتیازی سلوک کی بات کی جاتی ہے تو اس کے جواب میں ایسا پروپیگنڈہ شروع کر دیا جاتا ہے کہ خود مسلمان اسکا لرز دفاعی پوزیشن اختیار کر لیتے ہیں اور اسلامی حدود کے

حقیقت بس اتنی ہی ہے کہ بظاہر آزادی حاصل کرنے کے بعد بھی ذہنی غلامی کی خوہم میں اب تک باقی ہے۔ ہم میں سے ایک گروہ اب بھی یہی سمجھتا ہے کہ مغرب کی خواتین کی طرح آرائش و زیبائش اور لباس اختیار کر کے ہم بھی ترقی کی دوڑ میں ان کے شانہ بشانہ چل سکتے ہیں جب کہ ایک مسلمان عورت اپنے نظام معاشرت میں ان طریقوں کی پیروی کس طرح کر سکتی ہے جو مغربی تہذیب میں رائج ہیں کیونکہ مغرب نے حیا اور حجاب کو بالائے طاق رکھ کر مادی ترقی کے پردے میں عورت پر ذمہ داریوں کے دوہرے بوجھ ڈال دیئے ہیں۔ عورتوں کو گھر کی ”قید“ سے آزادی دلا کر اور مردوں کے لطف و لذت کا جو سامان کیا ہے اس کی انتہا ہے کہ معاشرے میں بن باپ بچوں کی نرسریوں کی تعداد بڑھتی جا رہی ہے جن کی سرپرستی ریاست کرتی ہے۔ اسلام کسی مادی ترقی کا مخالف نہیں لیکن وہ کسی ترقی کی آڑ میں پاکیزہ اور صالح تمدن کے اصولوں پر سمجھوتہ نہیں کر سکتا۔ ایک مسلمان عورت صنفی کمالات سے معاشرے میں پہچان برپا کرنے میں آزاد نہیں ہے۔ اسلام اس کی حدود واضح کرتا ہے۔

طرفہ تماشہ یہ ہے کہ اسلام حدود ایک مسلمان عورت کے لئے بیان کرتا ہے اور ان حدود پر اعتراض مغربی معاشرے کرتے ہیں نہ کہ خود مسلمان عورت۔ ساری دنیا کے میڈیا اور دانشوروں کو ایک موضوع بار بار ہاتھ آ جاتا ہے اور وہ ہے مسلمان عورت کے ساتھ ظلم (معاذ اللہ) وہ حیا اور حجاب پر شدید تنقید کرتے ہیں ان کی توپوں کا رخ پردے اور حجاب کی طرف ہو جاتا ہے چاہے ترکی ہو یا تیونس کی باپردہ عورتوں کے ساتھ ظلم، یا فرانس میں پردے کی پابندیاں یا مصری خاتون مروہ الشربینی کا محض حجاب کی وجہ سے جرمنی کی بھری عدالت میں قتل، جبکہ مسلح پولیس نے بھی اس کی مدد نہ کی۔

بلجیم کی پارلیمانی تاریخ میں پہلی بار ایک مسلمان خاتون کے منتخب

بارے میں مدافعتی دلائل تلاش کرنے لگتے ہیں۔

بدقسمتی سے نائن الیون کے بعد اسلام اور اسلام کی خاص علامت حیا اور حجاب کے خلاف مغرب نے متعصبانہ رویہ اور ان کے میڈیا نے بھرپور مہم جاری رکھی ہوئی ہے۔

سوال یہ ہے کہ سواگرز کا کپڑا وحشت اور خوف کی علامت کیسے بن گیا مغرب کی نظر میں..... جبکہ یہ نہ مسلمان عورت کا مسئلہ ہے نہ مسلم معاشروں کا۔ اگر سوال اتنا ہی ہے کہ اسلام عورت کی آزادی کا مخالف ہے تو اس پر تو مسلمان عورتوں کو احتجاج کرنا چاہیے نہ کہ مغربی میڈیا اور ان کے نام نہاد دانشوروں کو۔ چاہے وہ حدود قوانین ہوں، آدھی شہادت کا معاملہ ہو یا مردوں کو چار شاہیوں کی اجازت۔ ان مسائل کو مغربی میڈیا ہی اچھالتا رہا ہے اور سیکولر دانشور ایڑی چوٹی کا زور لگا کر ان کی حمایت پر کمر بستہ ہو جاتے ہیں۔

اگر سوال اتنا ہی ہے کہ عورت چہرہ کھولے یا نہ کھولے تو فقہاء کی تعبیرات کی روشنی میں یہ کوئی متنازعہ مسئلہ نہیں ہے کیونکہ اس حوالے سے دونوں طرح کی آرا پائی جاتی ہیں۔ اور حجاب لینا نہ لینا مسلمان عورت کا ذاتی معاملہ ہے۔ لیکن بات اتنی سادہ بھی نہیں۔ معاملہ چہرہ کھولنے اور سر ڈھانپنے سے بہت آگے ہے۔ یورپ کو تو ہمارا خاندانی نظام، حدود قوانین، تصور حیا سب ہی کچھ برا لگتا ہے، ترقی کی راہ میں رکاوٹ لگتا ہے جبکہ صالح تمدن کے اصولوں پر سمجھوتے کی اجازت نہیں دے سکتا۔

اسی لئے اسلام اور مغربی تہذیب کے تمدنی اصولوں اور نظام معاشرت میں اصولی اختلافات ہیں اسلامی سوسائٹی میں عورت سماج کی ترقی میں اپنی صلاحیتوں کے مطابق ضرور حصہ لے سکتی ہے مگر صنفی کمالات سے معاشرے میں ہیجان نہیں برپا کر سکتی اور وقت نے ثابت کیا ہے کہ بے حیائی اور بے حجابی کا تعلق صرف اسلام سے نہیں بلکہ انسانیت سے ہے کیونکہ بے حیائی اور بے حجابی کے نقصانات پوری انسانیت اٹھا رہی ہے۔ بے خدا معاشرے بے حیائی کے جو نقصانات برداشت کر رہے ہیں اس میں عبرت کا ایک جہاں پوشیدہ ہے۔ کیونکہ چند افراد کی بے حیائی کے عمل کا نقصان پورا معاشرہ اٹھاتا ہے۔

اسی لئے انسانی تہذیب کا آغاز اس وقت ہوا جب انسان کے اندر شر اور حیا کا جذبہ بیدار ہوا۔ قرآن بتاتا ہے کہ آدمؑ وحواءؑ اپنے آپ کو درختوں کے پتوں سے ڈھانپنے لگے۔ یہی شرف آدمیت ہے کہ حیا کا جذبہ بھی وہ جذبہ ہے جو اسے تمام مخلوقات سے افضل کرتا ہے اور حیا اسلامی معاشرے کا شعار ہے۔ یورپ جس حجاب کی مخالفت کرتا ہے مسلم اور غیر مسلم معاشروں میں، وہ اچھی طرح جانتا ہے کہ یہ حجاب محض ایک کپڑے کا ٹکڑا نہیں بلکہ نظام عفت و عصمت ہے جو معاشرے میں حیا کی آبیاری کرتا اور عفت کے چلن کو عام کرتا ہے۔

ایک کیتھولک راہبہ کے لباس کی ساری دنیا میں تعظیم کی جاتی ہے جبکہ ایک مسلمان عورت کا حجاب جو اللہ کی اطاعت و فرمانبرداری کا مظہر ہے اس کو یورپ کیوں تنقید کا نشانہ بناتا ہے اور مظلومیت کا مظہر گردانتا ہے، محض اس لئے کہ وہ اسلامی تہذیب کے احیا سے خوف کا شکار ہے۔ دنیا بھر کے کروڑوں انسان جن کی اکثریت شریف اور پاکدامن عورتوں پر مبنی ہے۔ ہمیں ترقی یافتہ اور سیکولر ممالک کی ان کوششوں پر خاموش نہیں رہنا چاہیے جو وہ اپنی اقدار کو دنیا بھر پر مسلط کرنے کے لئے کر رہے ہیں ہمیں اس نئے طاغوت کا مقابلہ کرنا ہے اور انسانیت کے شرف و عزت کو مٹانے والی سازشوں کو ناکام کرنے کے لئے جدوجہد کرنا ہے۔ مغرب تیراکی کے لباسوں میں گھومنے والی دو شیرازوں سے پریشان نہیں مگر باحجاب مسلمان عورت سے خوف زدہ ہے اس کا یہی تضاد اور تعصب ہے جو ہر اک کو سوچنے پر مجبور کرتا ہے کہ کیا یہی مغرب خود کو انسانی حقوق کا چیمپئن کہتا ہے؟

اسلام اور مسلمانوں کے خلاف تعصب کا مظاہرہ کرنے والوں کا مقابلہ کرنے کے لئے ہمیں معاشرے میں فعال کردار ادا کرنا ہوگا۔ یہ وقت ان کی سازشوں کو سمجھنے کا ہے اور اس یقین کا کہ اسلام دنیا کا وہ واحد مذہب ہے جو حقیقی معنوں میں عالمگیر کلچر تخلیق کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ مغربی تہذیب کے بہت نقصانات انسانیت نے بھگت لئے۔ اکیسویں صدی انشاء اللہ حیا اور حجاب کی صدی ہے۔ ضرورت ہے تو اپنے حصے کی شمع جلانے کی!

یہ کھڑکیاں!

ہیں..... انہیں عینک کا سہارا لینا پڑتا ہے..... پھر ان آنکھوں کی کیاری میں موتیا اتر آتا ہے..... منظر دھندلانے لگتے ہیں..... آنکھیں رگڑ رگڑ کر دیکھنا پڑتا ہے..... مگر منظر واضح نہیں ہوتا، تھک ہار کر تسلیم کرنا پڑتا ہے ع:

آنکھ دھندلائی ہوئی تھی شہر دھندلا یا نہ تھا
مگر اس وقت بھی ہم اپنی آنکھوں پر پڑا پردہ اٹھانے کو آمادہ نہیں ہوتے۔

ان آنکھوں کے قریب ترین ہمسائے یہ دوکان ہیں۔ ان کانوں سے ہم ہمیشہ ایک ہی کام لیتے ہیں کہ ایک سے سنتے اور دوسرے سے اڑا دیتے ہیں۔ کوئی نصیحت کرتا رہے ہمارے کانوں پر جوں نہیں رہتی۔ ان کانوں سے کن سونیاں لینا ہمیں بہت مرغوب ہے۔ ان کانوں سے اپنی تعریف سننے کے آرزو مند۔ کوئی ایک دفعہ تعریف کرے تو بار بار کہتے ہیں کہ ذرا پھر سے کہنا! (پھر سے کہو، کہتے رہو، اچھا لگتا ہے) کبھی کبھی تعریف کی یہ خواہش ہمیں لے ڈوبتی ہے۔

انہی کانوں کی بدولت ہم کا نا پھوسی کی وبا کو خوب فروغ دیتے ہیں جس سے نہ صرف دوسروں کا چین لٹتا ہے بلکہ بعض اوقات خود اپنے ہی گھر کو آگ لگ جاتی ہے۔ ہمارے کان میں ایک بات پڑ جائے، ہم اس رائی سے پہاڑ بنا دیتے ہیں۔ ان کانوں سے دوسروں کی (یعنی اپنی ہی بہنوں، بھائیوں، خالہ، ممانی، سہیلیوں، استانیوں) کی برائیاں ہم شوق سے سنتے ہیں اور حتی المقدور اس میں اضافے کا فریضہ انجام دیتے ہیں۔ ان ہی کانوں کے ذریعے ہم اپنی روح کو وہ غذا فراہم کرتے ہیں جو شیطان کو مرغوب ہے۔ یہی کان اگر کچے ہوں تو ہمیں منوں میں کسی سے ایسا بدگمان کر دیتے ہیں کہ نہ ہم کوئی عذر سننے کو تیار ہوتے ہیں نہ

یہ جو ہمارے چہروں پر دو آنکھیں ہیں..... انہیں ہم کبھی خوابوں سے سجاتے ہیں کبھی کا جل سے..... کبھی کونٹیکٹ لینز لگا کر ان کا رنگ بدلتے ہیں، دھوپ کی تمازت سے بچنے کے لئے کبھی ان پر کالا چشمہ چڑھا لیتے ہیں۔ جب ڈرتے ہیں تو آنکھیں بند کر لیتے ہیں..... حیران ہوتے ہیں تو آنکھیں کھلی کی کھلی رہ جاتی ہیں۔ دیکھنے کی چیز ہو تو ٹکٹی باندھ کر دیکھتے ہیں۔ کبھی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھتے ہیں کبھی کن آنکھیوں سے.....

ان آنکھوں کو کہنے والے ساغر بھی کہتے ہیں اور ڈوب جاتے ہیں..... جھیل کہتے ہیں اور اتر جاتے ہیں..... جادو کہتے ہیں اور سحر زدہ ہو جاتے ہیں..... قاتل کہتے ہیں اور دل و جان سے قتل ہو جانے پر آمادہ رہتے ہیں..... کوئی ان آنکھوں کو غزل کہتا ہے کوئی کنول..... کوئی انہیں چراغ کہتا ہے تو کوئی ستارہ..... کوئی کہتا ہے کہ تیری نظروں کے نذرانے زمانے.....!

ان جیتی جاگتی آنکھوں سے بنیادی طور پر ہم دیکھنے کا کام لیتے ہیں تعیشتات، ایجادات، تعمیرات، اشتہارات، ملبوسات، زیورات..... یکے بعد دیگرے..... منظر آنکھوں کے سامنے آتے رہتے ہیں۔ آنکھیں دیکھتی ہیں اور دل مانگتا ہے۔ ہائے اتنی اچھی! اُف اتنی زبردست! بس مجھے بھی چاہیے..... فوری! ہر قیمت پر..... بس ہمیں بھی دلا دو..... ہمیں بھی لا دو..... یہ آویزے..... یہ جھمکے..... یہ کنگن..... یہ لہنگے..... یہ پراڈو..... یہ مرس..... یہ کوٹھی..... یہ پلاٹ..... ہم ہر چیز پر ہاتھ رکھتے جاتے ہیں..... یہ بھی..... یہ بھی..... یہ بھی..... دامن بھر جاتا ہے مگر دل نہیں بھرتا۔

پھر رفتہ رفتہ ایمان کی طرح یہ آنکھیں بھی کمزور ہونے لگتی

صفائی کا موقع فراہم کرتے ہیں..... بس قطع تعلقی کا حتمی فیصلہ!

یہ کان بچوں کے ہوں اور ہمارے ہاتھوں کی دسترس میں بھی ہوں تو کان پکڑ کر مروڑتے جاتے ہیں اور اعترافِ جرم کروائے جاتے ہیں۔ کان مروڑتے جاتے ہیں اور کہتے جاتے ہیں کہ اب پھاڑو گے کاپی؟ اب کرو گے گندا کام؟ پھر بناؤ گے دیوار پر نقش و نگار؟ پھر بھولو گے تھری کا ٹیبل؟

ہم اس بات پر کبھی کان نہیں دھرتے کہ دیواروں کے بھی کان ہوتے ہیں..... ہمارے کانوں کو جو خفیہ معلومات فراہم کی جاتی ہیں اسے طشت از بام کرنے میں تاخیر کو ہم قانوناً جرم سمجھتے ہیں، اسے عام کرنے کے لئے ایسے بے چین رہتے ہیں جیسے گیس کا مرلیض ڈکار کیلئے بے چین رہتا ہے..... ہم کسی کے لیے جو برا بھلا سوچتے ہیں اس کی کانوں کا کسی کو خبر نہیں ہونے دیتے، مگر دوسروں کی نقل و حرکت پر کان لگائے رہتے ہیں۔

یہی دو آنکھیں اور یہی دو کان ہمارے دل کی کھڑکیاں ہیں۔ کھڑکیاں..... جو کسی گھر، کسی کمرے کے لیے انتہائی ضروری ہوتی ہیں۔ کھڑکیاں نہ صرف گھر کا یا کمرے کا حسن و بلا کرتی ہیں بلکہ ان کے ذریعے سے آنے والی دھوپ اور ہوا گھر کا ماحول خوشگوار اور گھر کے مکینوں کو صحت مند رکھتی ہے۔ کھڑکیاں..... گھٹن اور اندھیروں سے بچاتی ہیں..... کھڑکیوں کے کھلے پٹ سے باہر کا موسم دیکھا جاسکتا ہے۔ کھڑکی سے کبھی چاند کبھی چاند کا ٹکڑا دیکھا جاسکتا ہے۔ باہر کی دنیا میں کیا ہو رہا ہے..... سنا رہا ہے یا چہل پہل، کھڑکی کھلتے ہی ہم بے خبری کے مقام سے خبر کے دام میں آ جاتے ہیں۔ جس کمرے میں کھڑکی نہ ہو اسے کمرہ نہیں ”زندہ“ کہتے ہیں (کال کوٹھڑی) کھڑکی مسلسل کھلی رہے تو گرد و غبار بلا روک ٹوک گھر میں داخل ہو جاتے ہیں۔ باہر آندھی چلے تو گرد و غبار کے ساتھ ساتھ سوکھے پتے، کاغذ کے پرزے، ٹافیاں کے رپر ز بھی اندر آ جاتے ہیں..... ماحول آلودہ ہو جاتے ہیں، دیواریں گندی ہو جاتی ہیں۔ ہم بھی اپنی آنکھوں اور کانوں کی کھڑکیوں سے آنے والی کثیر خواہشات، تعصبات، حرص و ہوس، بغض و رقابت، جیسی حقیر

چیزوں کا ڈھیر دل جیسے پاکیزہ گھر میں جمع کرتے رہتے ہیں اور دل کے ”وائٹ پیلس“ کو کچرا کنڈی بنا چھوڑتے ہیں..... نہ بروقت صفائی کرتے ہیں نہ رنگائی، نہ دھلائی کر کے لوبان کی دھونی دیتے ہیں بس اس دل بے صورت میں گنجائش سے زیادہ کاٹھ کباڑ بھرے جاتے ہیں (اور مزید بھرنے کی ہوس رکھتے ہیں) جبکہ ہمارے چہروں کو آنکھوں کے چراغ بخشنے والے، ہماری سماعتوں کی آباد کاری کے لیے کانوں کے نذرانے عطا کرنے والا رب کریم کا کہنا ہے کہ:

”ہم نے انسان کو ایک مخلوط نطفے سے پیدا کیا تاکہ اس کا امتحان لیں، اور اس غرض کے لیے اسے سننے والا اور دیکھنے والا بنایا۔“ (سورہ الدھر آیت ۲)

گویا یہ کان اور یہ آنکھیں ہمیں محض چہرے کی خوبصورتی کے لیے نہیں دیئے گئے کہ ہم انہیں ”مالِ مفت“ سمجھتے ہوئے بے حسی کا معاملہ کریں اور اپنا کیا دھرا ان کے سر ڈال دیں۔ یہی کان اور یہی آنکھیں جو آج بلا معاوضہ ہماری خدمت پر مامور ہیں کل ہمارے ہی خلاف گواہی دیں گی..... کہ ہمیں سماعتوں اور بصارتوں سے نوازنے والا کہتا ہے کہ، ”پھر جب سب وہاں پہنچ جائیں گے تو ان کے کان اور ان کی آنکھیں اور ان کے جسم کی کھالیں ان پر گواہی دیں گی کہ وہ دنیا میں کیا کچھ کرتے رہے ہیں“ (حم السجدہ آیت ۲۰)

دعا ہے کہ ہمارا پیارا رب ہماری بصارتوں اور سماعتوں کو بحال رکھے، ان کے ذریعے ہمیں ہدایت اور آسانیاں عطا فرمائے اور آخرت میں انہیں ہمارا حمایتی اور مددگار بنائے۔ (آمین)

☆.....☆.....☆

آبادی بیگم (بی اماں)

والدہ علی برادران مولانا محمد علی جوہر، مولانا شوکت علی

بن کر چمکے۔

بی اماں کوئی امیر کبیر خاتون نہیں تھیں۔ انہوں نے اپنے محدود وسائل کے باوجود اپنے بچوں کو اعلیٰ تعلیم دلوائی۔ جب ان کے دونوں فرزندوں محمد علی اور شوکت علی نے انٹر کا امتحان پاس کر لیا تو ان کو اعلیٰ تعلیم کیلئے علی گڑھ یونیورسٹی میں داخلہ دلوایا۔ ان دنوں بہت سے لوگ انگریزی تعلیم کے مخالف تھے۔ بچوں کے چچا نے بھی انگریزی تعلیم کی مخالفت کی تو انہوں نے چپکے چپکے اپنا زیور بیچ کر بچوں کی تعلیم جاری رکھی۔ انگریزی تعلیم کے ساتھ انہیں دینی تعلیم سے بہرہ مندر کھا۔ وہ خود بھی نماز روزے کی پابند تھیں لہذا بچوں کو بھی اس کی پابندی کرواتی تھیں۔ ان کے تمام بچے ان کے از حد فرمانبردار تھے۔ کسی کی بھی مجال نہ تھی کہ ماں کے حکم کو ٹالے۔ 1898ء میں انہوں نے مولانا محمد علی کو گریجویشن کے بعد مزید اعلیٰ تعلیم کیلئے انگلستان بھیجا جبکہ مولانا شوکت علی نے علی گڑھ سے گریجویشن کیا۔ آکسفورڈ میں تعلیم کے دوران محمد علی کا ہندوستان آنا ہوا تو ان کی والدہ نے امجدی بیگم جو عظمت اللہ خان کی بیٹی تھیں سے ان کی شادی کروادی۔

وطن واپسی پر محمد علی نے شوکت علی کے ساتھ مل کر ریاست بڑودہ کی ملازمت کی جبکہ شوکت علی پرنس کریم آغا خان کے پرسنل سیکرٹری مقرر ہو گئے۔ بعد ازاں جب دونوں بھائیوں نے ملکی سیاست میں حصہ لینا شروع کیا تو بی اماں کی دعائیں ان کے شامل حال رہیں۔

مولانا محمد علی نے بھرپور صحافتی زندگی گزاری۔ آپ نے ٹائمز آف انڈیا میں انگریزی مضامین کا سلسلہ شروع کیا ”کچھ خیالات“ کے نام سے۔ آپ اردو زبان کے زبردست حامی تھے آپ نے 1910ء میں مسلم لیگ کے سالانہ اجلاس میں اردو زبان کی حمایت میں زبردست

یہ بات انتہائی تکلیف دہ ہے کہ جب بھی پاکستان کی آزادی کی تاریخ لکھی جاتی ہے تو بی اماں کی خدمات کو یکسر فراموش کر دیا جاتا ہے۔ کہیں کہیں ان کا ذکر ضمناً آ جاتا ہے۔ اس وقت اس بات کی اشد ضرورت ہے کہ ہمارے سکولوں، کالجوں کے کورسز میں بی اماں کی خدمات کو شامل کیا جائے اور اپنی موجودہ اور آئندہ آنے والی نسلوں کو ان کے کردار اور جدوجہد سے آشنا کیا جائے۔ تحریک خلافت کی کوششوں میں انہوں نے جو تقریریں کیں وہ جوش خطابت اور دلولے سے بھرپور ہوتیں۔ وہ اپنے دور کی پہلی خاتون تھیں جنہوں نے باقاعدہ عملی طور پر تحریک میں حصہ لیا، جلوسوں میں تقریریں کیں اور آزادی کا پیغام دیا۔

بی اماں 1850ء میں یوپی کے ایک معروف خاندان میں پیدا ہوئیں۔ ان کی جائے قیام سرک تھی۔ ان کے والد نے 1857ء کی جنگ آزادی میں دین اور وطن کی خاطر بھرپور حصہ لیا اور میدان جنگ سے واپس نہ آئے، یا تو شہید ہو گئے یا روپوش ہو گئے۔ والد کی وفات کے وقت بی اماں کی عمر صرف پانچ برس تھی۔ والد کے بعد انہوں نے بہت مشکل حالات میں وقت گزارا۔ وہ کچھ خاص تعلیم بھی نہیں حاصل کر سکیں لیکن اپنے وطن اور دین سے گہری محبت انہیں والد کی طرف سے ورثے میں ملا تھا ان کی شادی ریاست رامپور کے ایک مقتدر اور معزز آفیسر عبدالعلی خان سے ہوئی۔ اللہ تعالیٰ نے انہیں سات بچوں سے نوازا جن میں چھ بیٹے اور ایک بیٹی تھی۔ ابھی بی اماں کی عمر تیس برس تھی جب ان کے شوہر بیٹے کی وبا کے شکار ہو کر وفات پا گئے۔ انہوں نے بہت حوصلے سے یہ صدمہ برداشت کیا اور پوری تندرہی سے بچوں کی پرورش میں لگ گئیں۔ ان کی شب و روز محنت اور توجہ کے نتیجے میں ان کے دو بیٹے علی برادران مولانا محمد علی جوہر اور مولانا شوکت علی آسمان شہرت پر آفتاب

تقریر کی جسے لوگوں نے بے حد پسند کیا۔ اردو زبان کی خدمت کے طور پر انہوں نے اردو روز نامہ ”ہمدرد“ اور ”نقیب ہمدرد“ بھی جاری کیا۔ اس سے پہلے وہ کلکتہ سے انگریزی اخبار ”کامریڈ“ جاری کر چکے تھے۔

مولانا شوکت علی، محمد علی سے آٹھ سال بڑے تھے۔ آپ کرکٹ کے بہت اچھے کھلاڑی تھے اور کالج کی کرکٹ ٹیم کے کپتان بھی تھے۔ بڑے محکم شیم گرانڈیل اور دیو قیامت تھے۔ نہ وہ عالم دین تھے اور نہ ہی مقرر مگر راہ حق کے جاننا مسافر تھے۔ سیاست میں دونوں بھائی ایک جان دو قالب تھے اسی لئے علی برادران کے نام سے مشہور ہو گئے۔ بلاشبہ قابلیت، علم و فضل میں محمد علی اپنے بھائی سے کہیں بڑھ کر تھے مگر خدا خونی، دینی حمیت، ایثار، بے باکی، بہادری میں دونوں ایک دوسرے سے بڑھ چڑھ کر تھے۔ مولانا شوکت علی کو قائد اعظم کے قریبی ساتھی ہونے کا بھی اعزاز حاصل ہے۔ قائد اعظم ان کی بہت قدر کرتے تھے۔ ان کی وفات پر قائد اعظم کئی روز تک مغموم رہے اور ان کی تدفین کے وقت کئی گھنٹے تک جامع مسجد کی سیڑھیوں میں بیٹھے رہے اور انہیں دفن کرنے کے بعد ہی وہاں سے رخصت ہوئے۔

پہلی جنگ عظیم 1914ء تا 1918ء کے بعد برطانوی حکومت نے ترک سلطنت کو اپنے غیظ و غضب کا نشانہ بنایا اور اندرونی و بیرونی سازشیں کر کے خلافت عثمانیہ کا مکمل طور پر خاتمہ کر دیا۔ ترکی جو ملت اسلامیہ کی عظیم سلطنت تھی ٹکڑے ٹکڑے ہو گئی جس سے ہندوستان کے مسلمانوں میں غم و غصے کی لہر دوڑ گئی۔ ہندوستان کے مسلمانوں نے جنگ کی صورت میں ہونے والے شدید نقصان کے مداوے کیلئے طبی امداد، راشن، کپڑے، روپے روزمرہ ضرورت کی اشیاء، ادویات وافر مقدار میں بھیجے اور خلافت کی بحالی کیلئے زبردست تحریک چلائی۔ اس سلسلے میں مولانا محمد علی اور شوکت علی نے ملک بھر کے طویل دورے کیلئے شہروں، قصبوں، دیہاتوں میں جا کر بھرپور جلسے کئے اور مسلمانوں کی غیرت کو جھنجھوڑا۔ مولانا شوکت علی کو چندہ جمع کرنے میں یدِ طولیٰ حاصل تھا۔ وہ جہاں کہیں بھی جاتے ملی اور سماجی کاموں کیلئے چندہ حاصل کر لیتے۔ کسی کو ان کے سامنے انکار کی مجال نہ ہوتی۔ لوگ خوشی خوشی انہیں چندہ دے دیتے۔ یوں انہوں نے تحریک خلافت کی کامیابی

کیلئے بے شمار اعانت جمع کی۔ ستمبر 1921ء میں حکومت نے علی برادران اور ان کے پانچ ساتھیوں کو گرفتار کر لیا اور ان پر مقدمہ چلانے کا حکم دیا۔ اس مقدمے کی سماعت خالق دینا ہال میں شروع ہوئی اور یکم اکتوبر تک جاری رہی اور سب کو دو دوس برس کی سزا سنائی گئی۔ اسی زمانے میں کسی صاحب دل نے ”صدائے خاتون“ کے نام سے ایک نظم لکھی جو دیکھتے ہی دیکھتے مسلمانوں کے بچے بچے کی زبان پر چڑھ گئی۔ اس نظم نے پورے ملک میں جوشِ شہرت اور مقبولیت پائی اس کی مثال نہیں ملتی۔

صدائے خاتون کے چند اشعار ملاحظہ فرمائیں۔

بولیں اماں محمد علی کی، جان بیٹا خلافت پہ دے دے دو
ساتھ تیرے ہے شوکت علی بھی، جان بیٹا خلافت پہ دے دے دو
ہو تمہیں میرے گھر کا اجالا، تھا اسی واسطے تم کو پالا
کام کوئی نہیں اس سے اعلیٰ، جان بیٹا خلافت پہ دے دے دو
اے میرے لاڈلو میرے پیارو، اے میرے چاند اے میرے تارو
میرے دل کے جگر کے سہارو، جان بیٹا خلافت پہ دے دے دو
صبر سے جیل خانے میں رہنا، جو مصیبت پڑے اس کو سہنا
کیجیو اپنی ماں کا یہ کہنا، جان بیٹا خلافت پہ دے دے دو
اس نظم کے بارے میں لوگ کہتے ہیں کہ ہندوستان کے دور افتادہ گاؤں صحرا پہاڑی علاقے جہاں آبادی بھی بہت کم تھی وہاں کے بھی بچے بچے کی زبان پر یہ نظم تھی۔ دیہاتی عورتیں جو مکمل طور پر ان پڑھ تھیں انہیں بھی یہ نظم پوری یاد تھی اور وہ اسے کھیتوں کھلیانوں میں گاتی پھرتی تھیں۔ بلکہ ڈھولک کی تھاپ پر بھی اسے گایا جاتا تھا۔ مختلف تقریبات میں مسلمان عورتیں چاہے وہ اعلیٰ طبقے سے تعلق رکھتی ہوں یا ادنیٰ سے، اسے اہتمام سے گاتی تھیں۔ جن دنوں بی اماں کے فرزند قید و بند کی صعوبتیں کاٹ رہے تھے اور بی اماں بڑے صبر اور حوصلے سے یہ وقت گزار رہی تھیں۔ انہی دنوں یہ خبر مشہور ہو گئی کہ مولانا محمد علی بعض دوسرے لوگوں کی طرح معافی مانگ کر رہا ہو جائیں گے۔ بی اماں نے یہ خبر سنی تو غضبناک ہو گئیں اور بولیں ”ایسا ہرگز نہیں ہو گا۔ محمد علی اسلام کا سپوت ہے۔ اگر اس نے ایسا کیا تو میرے بوڑھے ہاتھوں میں اتنی طاقت ہے کہ میں اس کا گلا گھونٹ دوں۔ ایسی

زندگی پر جس سے اسلام پر حرف آئے لعنت ہے۔“

بوڑھی اور کمزور ہونے کے باوجود شہر جا کر تقریریں کرتیں۔ ان کی تقریروں کا موضوع صرف اسلام اور آزادی ہوتا وہ اکثر کہا کرتیں۔
 ”دنیا کے تمام مسلمان مجھے ایسے ہی عزیز ہیں جیسے محمد علی اور شوکت علی۔“
 1923ء میں جامعہ ملیہ دہلی میں ایک جلسہ حکیم اجمل خان کی صدارت میں منعقد ہوا۔ اس میں تقریر کرتے ہوئے فرمایا۔ ”بیٹھ میں نے برقع اتار دیا ہے اس لئے کہ اب اس ملک میں کسی کی آبرو باقی نہیں رہی۔ میں نے 1857ء میں اپنے جھنڈے کو لال قلعے سے اترتے دیکھا تھا، اب میری تمنا ہے کہ بدلی جھنڈے کو لال قلعے سے اترتے دیکھوں۔“

ان کی تقریروں میں جذبہ حریت، دین سے وابستگی، غیور قوم کی بیٹی کا ساجہ و جلال پایا جاتا تھا۔ سچائی کی راہ پر چلنے میں وہ کسی قسم کا سمجھوتہ کرنے کو تیار نہ تھیں۔ ان کے ایسے پر جوش خطابات کو سن کر ہی ”صدائے خاتون“ جیسی نظم وجود میں آئی۔

جب علی برادران کے ساتھ مولانا حسین احمد مدنی، ڈاکٹر سیف الدین کچلو، مولانا ثار احمد کانپوری، مولانا غلام مجدد سرہندی اور سوامی شنکر اچاریہ کو دو سال تک قید و بند کی صعوبتیں برداشت کرنا پڑیں تو اسی شاعر (بلیں) نے ”صدائے مظلوم“ نامی نظم بھی لکھی اور اسے بھی بھرپور پذیرائی ملی اور بہت عرصہ تک یہ نظم بھی زبان زد عام رہی۔

بی اماں بہت سادہ لباس پہنتیں وہ اپنے لباس کیلئے خود سوت کا تا کرتیں۔ ان کا لباس لمبے کرتے، چوڑی دار پاجامے اور ایک دوپٹے پر مشتمل ہوتا۔

بی اماں نماز روزے کی سختی سے پابندی کرتیں۔ سفر ہو یا حضر پنج وقت نمازوں کے علاوہ تہجد گزار بھی تھیں۔ دینی کتب اور اخبارات دوسروں سے پڑھوا کر سنیں تاکہ حالات حاضرہ سے مکمل واقفیت رہے۔

12 اور 13 نومبر 1924ء کی درمیانی شب وہ اس جہان فانی سے کوچ کر گئیں اور اپنے پیچھے صبر، حوصلہ، استقامت، جدوجہد اور بہادری کی ایک بہترین مثال چھوڑ گئیں۔

علی برادران نے والدہ کی وفات کے بعد بھی اپنی جدوجہد جاری رکھی اور ان کی کوششوں میں ان کی والدہ کی دعائیں قدم بہ قدم ان کے ساتھ ہیں۔
 وہ جون کا مہینہ اور 1930ء کا سن تھا جب مولانا محمد علی شہید بیمار ہو گئے۔ آپ شملہ ہسپتال میں داخل تھے کہ برطانیہ کے وائسرائے کی جانب سے گول میز کانفرنس میں شرکت کا دعوت نامہ ملا جسے انہوں نے علیل ہونے کے باوجود منظور کر لیا اور نومبر میں وہ کانفرنس میں شرکت کیلئے بذریعہ بحری جہاز انگلستان چلے گئے۔ سفر میں ایک ماہ لگا۔ راستے میں طبیعت بگڑ گئی۔ آپ ذیابیطس اور فشارخون کے مریض تھے۔ ڈاکٹر نے آرام کرنے کا مشورہ دیا مگر آزادی کی لگن انہیں چین سے نہیں بیٹھنے دیتی تھی۔ کچھ دن پیرس میں علاج کروایا پھر لندن چلے گئے۔

19 نومبر 1930ء کو لندن میں گول میز کانفرنس میں زبردست تقریر کی اور اعلان کیا کہ یا تو ہندوستان کی آزادی کا پروانہ لے کر جاؤں گا یا یہیں مر جاؤں گا۔ کم از کم ایک غلام ملک میں مرنے سے توفیق جاؤں گا۔

یکم جنوری 1931ء کو وزیراعظم برطانیہ کو ایک طویل خط لکھا۔ دو جنوری کی رات کو جسم کے دائیں جانب فالج کا حملہ ہوا اور تین جنوری اتوار صبح ساڑھے نو بجے آپ وفات پا گئے۔ سارے عالم اسلام میں صف ماتم بچھ گئی۔ ان کے بھائی مولانا شوکت علی نے ان کی میت بیت المقدس میں لے جا کر دفن کی۔ علامہ اقبال کو ان کی وفات پر شدید صدمہ ہوا انہوں نے ان کی وفات پر اور ان کی خدمات کو خراج تحسین پیش کرنے کیلئے ایک نظم بھی لکھی۔ محمد علی بہترین شاعر بھی تھے۔ جو ہر تخلص کرتے تھے۔ ان کے کلام کا مجموعہ ”گنجینہ جوہر“ کے نام سے منظر عام پر آچکا ہے۔

آپ کی خدمات کو خراج تحسین پیش کرنے کیلئے پاکستان بھارت اور سنگاپور میں بہت سی مسجدوں، تعلیمی اداروں، ہسپتالوں، سڑکوں اور ویب سائٹس کے نام ان کے نام سے منسوب ہیں۔

استفادہ: انٹرنیٹ۔ تاریخ اسلام کی چار سو باکمال خواتین از طالب ہاشمی



ہم پرورش لوح و قلم کرتے رہیں گے

مقاصد، تاریخ اور حریم ادب کے تحت شائع شدہ کتب پر مبنی سلائڈز حاضرین محفل کی دلچسپی کا باعث تھیں، جبکہ نائیں جانب مصنفات و ناول نگار حمیدہ بیگم، بنت الاسلام، عفت قریشی، قانتہ رابعہ، صائمہ اسماء، فرزانہ چیمہ و دیگر کی کتابوں کا اسٹال لگایا گیا تھا۔

تقریب کا باقاعدہ آغاز ثناء علیم کی تلاوت کلام پاک اور ترجمہ سے ہوا۔ بطور صدر حریم ادب راقمہ نے شرکا کو گرم موسم کے باوجود بھرپور شرکت پر خوش آمدید کہا اور اپنی چند گزارشات پیش کرتے ہوئے عرض کی کہ لکھنے والا اپنی اقلیم کا بے تاج بادشاہ ہوتا ہے جو قلم کے ہنر سے ذہن و دل کی کاپی لٹ سکتا ہے۔ تخلیقی کرب اور ہنرمل کر تحریر کو جاندار بناتے ہیں۔ ادب ایک ایسا آئینہ ہے جس میں ادیب معاشرے کی پرچھائیاں دکھاتا ہے۔ موثر تحریر زندگی کو بے مقصدیت کے دائرے سے نکال کر عظیم تر مقصد عطا کرنے کی صلاحیت رکھتی ہے۔ آپ قلمکار بہنوں کی ہماری محفل میں شرکت ہمارے لیے اعزاز ہے۔ ’میں کیوں لکھوں‘ اس موضوع پر اپنے خیالات فی البدیہہ رقم کیجئے اور سنا کر محفل کا رنگ دوبالا کر دیجیے۔

ابتدا ناول نگار صبیحہ شاہ نے کی اور اپنے خوبصورت انداز میں تحریر سنا کر سناں باندھ دیا۔ پھر رنگارنگ موتیوں کی مالا کے مانند ایک ایک کر کے شرکا آتی گئیں، فرحی نعیم، سیدہ بنت حسینی، منیزہ نور العین، طیبہ شاکر، رقیہ احسان و دیگر، اور اپنی تحریروں سے حاضرین محفل کو محظوظ کرتی گئیں۔ صدر مجلس افشاں نوید نے اپنے تبصرے میں کہا کہ خیال کی قوت کو جب قلم دے دیا جائے تو ابلاغ کا کام شروع ہو جاتا ہے، قلم کی صلاحیت ذمہ داری و آگہی کو بڑھاتی ہے، آپ نے اپنے جذبات کو تحریروں میں سمو یا ہوا ہے اور یہ جذبے مستعد رہنے کا نام ہیں۔ کوئی بھی تحریر لکھنے سے پہلے ذہنی طور پر تیار اور واضح ہونا ہی دراصل بہترین تحریر کی ضمانت ہے، منتشر ذہن، مبہم خیالات کو جھٹک کر یقین کی چٹنگی کے ساتھ مدلل تحریر لکھیں۔ پر عزم پر اعتماد، بہترین معلومات، اور خوبصورت

احساسات اور جذبات کو الفاظ کی زبان میں تخلیق کرنا ادب ہے جس کی حوصلہ افزائی اور آبیاری کے لیے ادبی محافل ناگزیر ہیں۔

گزشتہ دنوں حریم ادب پاکستان کے تحت کراچی میں ادبی محفل کا انعقاد کیا گیا۔ تقریب ایک مقامی ہال میں منعقد ہوئی جس میں ادبی ذوق رکھنے والی بہت سی خواتین نے ذوق و شوق سے شرکت کی۔ حریم ادب کا مقصد ادبی سرگرمیوں کے ذریعے معاشرے میں مثالی اقدار کو فروغ دینا ہے۔ یہ ادبی محفل اسی سرگرمی کا حصہ تھی۔ تقریب کی خوش آمد بات یہ تھی کہ جماعت اسلامی حلقہ خواتین کی سربراہ دردانہ صدیقی صاحبہ مہمان خصوصی کے طور پر شریک تھیں۔ دردانہ نہ صرف ادبی ذوق رکھتی ہیں بلکہ ادبی محافل کے انعقاد میں اپنا بھرپور تعاون بھی پیش کرتی ہیں۔ ان کے بھرپور تعاون پر اور کل وقتی شرکت پر ہم ان کے شکر گزار ہیں۔ معروف کالم نگار افشاں نوید نے صدر مجلس کے فرائض انجام دیے۔ حال ہی میں ان کے منتخب کالموں کا مجموعہ ’نوید فکر‘ شائع ہو کر مقبولیت حاصل کر چکا ہے۔ افسانہ کالم نگار حمیرا خالد کی اناؤنسمنٹ نے سامعین کی توجہ پروگرام کی طرف مبذول رکھی۔

تقریب کے شرکا میں سوشل میڈیا پر سرگرم عالیہ منصور، سعدیہ حمہ اور قلمی دنیا سے تعلق رکھنے والی خواتین کی بڑی تعداد شامل تھی جن میں ناول نگار صبیحہ شاہ، نصرت یوسف، ہم چھینل کی اسکرپٹ رائٹر، مصنفہ و شاعرہ غزالہ رشید، کالم نگار و مصنفہ فریحہ مبارک، عاتکہ ملک، معروف شاعرہ روبینہ فرید، وجاہت نسیم، ثیا ملک، افسانہ نگار فرحی نعیم، نور العین، رقیہ احسان، طیبہ شاکر و دیگر قلمکار موجود تھیں۔ ’’میں کیوں لکھوں‘‘ کے موضوع پر قلمکار خواتین نے اپنی فی البدیہہ تحریروں سنا کر حاضرین محفل سے داد و وصول کرنی تھی جبکہ اس دوران روبینہ فرید، افشاں نوید، نصرت یوسف اور فریحہ مبارک نے پڑھی گئی تحریروں پر تبصرہ کیا۔

اسٹیج کے دائیں جانب آویزاں سکریں پر حریم ادب کے اغراض و

خیالات کو الفاظ کا روپ دے کر دل جمعی کے ساتھ لکھتے رہیے کہ لکھنے کا فن دراصل ریاضت ہی سے نکھرتا ہے۔ واضح مقصد کے بغیر لکھی گئی تحریر اس جسم کی مانند ہے جس میں روح نہ ہو۔

تحریروں کے دوران گاہے بگاہے محفل میں موجود شاعرات سے ان کا کلام سنا گیا۔ ثریا ملک، روبینہ فرید اور وجاہت نسیم نے نظموں اور غزلوں سے حاضرین کو محظوظ کیا۔ روبینہ فرید کا کہنا تھا کہ ہر تحریر میں مزید بہتری کی گنجائش موجود ہوتی ہے اس لیے لکھاری اپنی تحریر کو حتمی یا قطعی خیال نہ کرے بلکہ نظر ثانی ضرور کرے۔ ناقابل اشاعت تحریر پر دل بردا شیت نہ ہوں بلکہ چیلنج قبول کرتے ہوئے مستقل مزاجی کے ساتھ مسلسل مشق جاری رکھیں کیونکہ لکھنا ایک مسلسل عمل ہے اور یہ ایک ایسا سلسلہ ہے جو کبھی ختم نہیں ہوتا، اس گہرے سمندر میں غوطہ زنی کرنے والے کو قیمتی اور نایاب موتی ضرور ملتے ہیں۔

مہمان خصوصی دردانہ صدیقی صاحبہ جواب تک بے حد دلچسپی سے تحریریں اور ان پر تبصرے سن رہی تھیں، آخر میں سب کی تحریروں کو سراہتے ہوئے کہنے لگیں کہ میرے لیے یہ بے حد خوشی کی بات ہے کہ مجھے اہل قلم سے گفتگو کا موقع مل رہا ہے۔ اللہ نے آپ کو قلم کی صلاحیت دی، اختیار کی آزادی دی، یہ اللہ رب العزت کی جانب سے ہے اور احساس و شعور رکھنے والوں پر لازم ہے کہ اس نعمت کا حق ادا کریں اور قلم کے ذریعے خیر کی پذیرا ئی کریں۔ ادب کا مقصد اعلیٰ انسانی اقدار، اخلاق و کردار کو ہمیز کرنا ہے۔ لکھنا ایک فن ہے اور اس فن کے لیے ہر قسم کی موثر تکنیک کا استعمال آپ کی اہم ضرورت ہے۔ کسی بھی کامیابی کے لیے دو چیزوں پر انحصار کامیابی حاصل کر لینے کے مترادف ہے اور وہ ہے بھروسہ اور حوصلہ، بھروسہ وہ قوت ہے جو متزلزل نہیں ہونے دیتی اور عمل پر آمادہ رکھتی ہے، اور حوصلہ ہر مشکل کو انگیز کرنا سکھاتا ہے۔ ادیب کے لیے یہ بھی اہم ہے کہ وہ معرکہ حق و باطل میں قلم کے ذریعے حق کا علمبردار بنے۔

عالیہ منصور نے حریم ادب کے منتظمین کو اس خوبصورت محفل کے انعقاد پر مبارکباد دی۔ سابق صدر حریم ادب پاکستان فرحت طاہر کی عدم موجودگی محسوس ہوتی رہی جو نجی مصروفیت کی بنا پر اس محفل میں شریک نہ ہو سکی تھیں۔



ایک استاد عدالت کے کٹہرے میں

السنس۔ تو میں نے اس سے کہا میں زبان نہیں جانتا۔ اس نے کہا، جنگی بھلی بول رہے ہو۔ میں نے کہا، میں نہیں جانتا تم ایسے ہی جھوٹ بول رہے ہو۔ میں تو نہیں جانتا ہوں۔ اس نے کہا، نہیں آپ اپنا لائنسنس دیں۔ تو میں نے کہا، فرض کریں جس کے پاس اس کا لائنسنس نہ ہو تو پھر وہ کیا کرے۔ اس نے کہا کوئی بات نہیں۔ میں آپ کا چالان کر دیتا ہوں۔ پرچی پھاڑ کے تو یہ آپ لے جائیں اور جرمانہ جمع کروادیں۔ میں تو ایسے ہی مانگ رہا تھا۔ میں نے کہا، مجھ سے غلطی ہوگئی۔ اس نے مسکراتے ہوئے کہا غلطی ہوگئی تھی تو چلے جاتے۔ اس نے بغیر مجھ سے پوچھے کاپی نکالی اور چالان کر دیا اور چالان بھی بڑا سخت، بارہ آنے جرمانہ۔ میں نے لے لی پرچی۔ میں نے کہا، میں اس کو لے کر کیا کروں۔ اس نے کہا اپنے کسی بھی قریبی ڈاکخانے میں منی آرڈر کی کھڑکی پر جمع کروادیں۔ بس وہاں کچہری نہیں جانا پڑتا، دھکے نہیں کھانے پڑتے۔ بس آپ کو جرمانہ ہو گیا، آپ ڈاکخانے میں دیں گے تو بس۔

میں جب چالان کروا کے گھر آ گیا تو میں نے اپنی لینڈ لیڈی سے کہا، میرا چالان ہو گیا ہے۔ کہنے لگی، آپ کا۔ میں نے کہا، میں کیا کروں۔ اب ان کو ایسے لگا کہ ہمارے گھر میں جیسے ایک بڑا مجرم رہتا ہے۔ اور اس نے اپنی بیٹی کو بتایا کہ پروفیسر کا چالان ہو گیا ہے۔ بڑھی مائی تھی۔ ان کی ایک ساس تھی اس کو بھی بتایا۔ سارے روتے ہوئے میرے پاس آ گئے۔ میں بڑا ڈرا کہ یا اللہ یہ کیا۔ کہنے لگے تو شریف آدمی لگتا تھا۔ اچھے خاندان کا اچھے گھر کا لگتا تھا۔ ہم نے تجھے یہ کرائے پر کمرہ بھی دیا ہوا ہے لیکن تو ویسا نہیں نکلا خیر گھر خالی کرنے کو تو نہیں کہا۔ جو بڑھی مائی تھی، ان کی ساس، اس نے کہا۔ ہو تو گیا ہے برخوردار چالان۔ لیکن کسی سے ذکر نہ کرنا۔ محلے داری کا معاملہ ہے۔ اگر ان کو پتہ چل گیا کہ اس کا چالان ہو گیا ہے تو بڑی رسوائی ہوگی۔ لوگوں کو پتہ چلے گا میں

میں جس زمانے میں روم میں لپکھر رہا تھا، روم یونیورسٹی میں اور میں سب سے Youngest پروفیسر تھا۔ یونیورسٹیوں میں چھٹیاں تھیں، گرمیوں کا زمانہ تھا۔ دوپہر کے وقت ریڈیو سٹیشن پر مجھے اردو براڈ کاسٹنگ کرنی پڑتی تھی۔ لوٹ کے آرہا تھا تو خواتین و حضرات روم میں دوپہر کے وقت سب لوگ قیلولہ کرتے تھے۔ 4 بجے تک سوتے تھے اور روم کی سڑکیں تقریباً خالی ہوتی تھیں، اور کارپوریشن نے یہ انتظام کر رکھا تھا کہ وہ وہاں پر پانی کے حوض لگا کر سڑکیں دھوتے ہیں اور شام تک سڑکیں ٹھنڈی بھی ہو جاتی ہیں، خوشگوار بھی ہو جاتی ہیں، صاف بھی ہو جاتی ہیں۔ تو وہ سڑکوں کو دھورہے تھے۔ اکا دکا کوئی ٹریفک کی سواری آ جا رہی تھی۔ تو میں اپنی گاڑی چلاتا ہوا جا رہا تھا۔ میں نے دیکھا کہ گول دائرہ ہے اس کے اوپر میں پکڑ کاٹ کے آؤں گا۔ پھر میں اپنے گھر کی طرف مڑوں گا تو یہ بڑی بے ہودہ بات ہے۔ بیچ میں سے چلتے ہیں۔ اس وقت کون دیکھتا ہے، دوپہر کا وقت ہے۔ تو میں بیچ میں سے گزرا وہاں ایک سپاہی کھڑا تھا، اس نے مجھے دیکھا اور اس نے پروا نہیں کی۔ جانے دیا کہ یہ جا رہا ہے یہ نوجوان تو کوئی بات نہیں۔ جب میں نے دیکھا شیشے میں سے گردن گھما کے کچھ مجھے تھوڑا سا یاد پڑتا ہے۔ میں طنزاً مسکرایا۔ کچھ اپنی فیٹ (Fate) کے اوپر کچھ اپنی کامیابی کے اوپر۔ میں نے خوشی منانے کے لئے ایک مسکراہٹ کا پھول اس کی طرف پھینکا۔ جب اس نے دیکھا کہ اس نے میری یہ عزت کی ہے تو اس نے سیٹی بجاکے روک لیا۔

اب وہاں پر سیٹی بجنا موت کے برابر تھی اور رُکنا بھی، میں رُکا، وہ آ گیا اور آ کے کھڑا ہو گیا۔ پہلے سلیوٹ کیا، ولایت میں رواج ہے کہ جب بھی آپ کا چالان کرتے ہیں، آپ کو پکڑنا ہوتا ہے تو سب سے پہلے آ کر سلیوٹ مارتے ہیں تو اس نے کھڑے ہو کر سلیوٹ مارا اب میں اندر تھر تھر کانپ رہا ہوں۔ شیشہ میں نے نیچے کیا تو مجھے کہنے لگا کہ آپ کا

کمرے میں پہنچے تو وہ ہاں تشریف فرما تھے۔ مجھے ترتیب کے ساتھ بلایا گیا تو میں چلا گیا۔ اب بالکل میرے بدن میں روح نہیں ہے، اور میں خوفزدہ ہوں، اور کانپنے کی بھی مجھ میں جرأت نہیں۔ اس لئے کہ تشنہ جیسی کیفیت ہوگئی تھی، انہوں نے حکم دیا، آپ کھڑے ہوں اس کٹہرے کے اندر۔ اب عدالت نے مجھ سے پوچھا کہ آپ کا چالان ہوا تھا اور آپ کو یہ حکم دیا گیا تھا کہ آپ یہ بارہ آنے ڈاکخانے میں جمع کروائیں، کیوں نہیں کروائے؟ میں نے کہا، جی مجھ سے کوتاہی ہوئی، مجھے کروانے چاہئیں تھے، لیکن میں..... اس نے کہا، کتنا وقت عملے کا ضائع ہوا۔ کتنا پولیس کا ہوا، اب کتنا ”جسٹیک کا“ ہوا (جسٹس عدالت کا ہو رہا ہے) اور آپ کو اس بات کا احساس ہونا چاہیے تھا۔ ہم اس کے بارے میں آپ کو کڑی سزا دیں گے۔ میں نے کہا، میں یہاں پر ایک فارنر ہوں۔ پردیسی ہوں۔ جیسا ہمارا بہانہ ہوتا ہے، میں کچھ زیادہ آداب نہیں سمجھتا۔ قانون سے میں واقف نہیں ہوں تو میرے پر مہربانی فرمائیں۔ انہوں نے کہا، آپ زبان تو ٹھیک ٹھاک بولتے ہیں۔ وضاحت کر رہے ہیں۔ آپ کیا کرتے ہیں تو میں چپ کر کے کھڑا رہا۔ پھر انہوں نے پوچھا کہ عدالت آپ سے پوچھتی ہے کہ آپ کون ہیں، اور آپ کا پیشہ کیا ہے؟ میں نے کہا، میں ایک ٹیچر ہوں۔ پروفیسر ہوں۔ روم یونیورسٹی میں۔ تو وہ جج صاحب کرسی کو سائیڈ پر کر کے کھڑا ہو گیا اور اس نے اعلان کیا Teacher in the Court. Teacher in the Court جیسے اعلان کیا جاتا ہے اور وہ سارے اٹھ کر کھڑے ہو گئے۔ منشی، تھانیدار، عمل دار جتنے بھی تھے اور اس نے حکم دیا کہ Chair should be brought for the

teacher. A teacher has come to the court.

اب وہ کٹہرا چھوٹا سا، میں اس کو پکڑ کر کھڑا ہوں۔ وہ کرسی لے آئے۔ حکم ہوا کہ تو Teacher ہے، کھڑا نہیں رہ سکتا۔ تو پھر اس نے ایک بانی پڑھنی شروع کی۔ جج نے کہا کہ اے معزز استاد! اے دنیا کو علم عطا کرنے والے استاد! اے محترم ترین انسان! اے محترم انسانیت! آپ نے ہی ہم کو عدالت کا اور عدل کا حکم دیا ہے اور آپ ہی نے ہم کو یہ علم پڑھایا ہے اور آپ ہی کی بدولت ہم اس جگہ پر براہمن ہیں۔ اس لئے

نے کہا، میں پتہ نہیں لگتے دوں گا۔ میری لاابالی طبیعت، 26 سال کی عمر تھی۔ چالان جیب میں ڈالا اور نکل گیا دوستوں سے ملنے۔ اگلے دن مجھے جمع کروانا تھا، بھول گیا۔ پھر سارا دن گزر گیا۔ اس سے اگلے دن مجھے اصولاً جمع کروادینا چاہیے تھا تو میں نے کپڑے بدلے تو اس پرانے کوٹ میں رہ گیا۔ شام کے وقت مجھے ایک تار ملا کہ محترمی جناب پروفیسر صاحب فلاں فلاں مقام پر فلاں چوراہے پر آپ کا چالان کر دیا گیا تھا، فلاں سپاہی نے۔ یہ نمبر ہے آپ کے چالان کا۔ آپ نے ابھی تک کہیں بھی چالان کے پیسے جمع نہیں کروائے یہ بڑی حکم عدولی ہے۔ مہربانی فرما کر اسے جمع کروادیں۔ آپ کی بڑی مہربانی ہوگی۔ تقریباً 21 روپے کا تار تھا۔ میں نے سارے لفظ گئے۔ مجھ سے یہ کوتاہی ہوئی کہ میں پھر بھول گیا، اور ان کا پھر ایک تار آیا۔ اگر آپ اب بھی رقم جمع نہیں کروائیں گے تو پھر ہمیں افسوس ہے کہ کورٹ میں پیش کر دینا پڑے گا۔ مجھ سے کوتاہی ہوئی، نہیں جاسکا۔ تب مجھے کورٹ سے ایک سمن آ گیا کہ فلاں تاریخ کو عدالت میں پیش ہو جائیں اور یہ جو آپ نے حکم عدولی کی ہے، قانون توڑا ہے، اس کے بارے میں آپ سے پورا انصاف کیا جائے گا۔ ان کی بولی، چونکہ رومن لاء وہیں سے چلا ہے تو بڑی تفصیل کے ساتھ۔ اب میں ڈرا، میری سٹی گم ہوئی۔ پریشان ہوا کہ اب میں دیار غیر میں ہوں۔ کوئی میرا حامی و ناصر مددگار نہیں ہے۔ میں کس کو اپنا والی بناؤں گا۔ میرا ڈاکٹر تھا۔ ڈاکٹر بالدی اس کا نام تھا، نوجوان تھا۔ میں نے اس سے کہا، مجھے وکیل کر دو۔ اس نے کہا، میرا ایک دوست ہے۔ اس کے پاس چلتے ہیں۔ اس کے پاس گئے۔ اس نے کہا، یہ تھوڑا سا پیچیدہ ہو جائے گا۔ اگر میں گیا عدالت میں۔ بہتر یہی ہے پروفیسر صاحب جائیں اور جا کر خود Face کریں عدالت کی خدمت میں یہ عرض کریں کہ چونکہ اس قانون کو ٹھیک طرح سے نہیں جانتا تھا۔ میں یہاں پر ایک غیر ملکی ہوں تو مجھے معافی دی جائے میں ایسا آئندہ نہیں کروں گا۔

میں نے کہا ٹھیک ہے۔ چنانچہ میں ڈرتا ڈرتا چلا گیا۔ اگر آپ کو روم جانے کا اتفاق ہو تو ”پالاس آف دی جستی“ وہ رومن زمانے کا بہت بڑا وسیع و عریض ہے، اسے تلاش کرتے کرتے ہم اپنے جج صاحب کے

بیوروکریٹ ہو، یہاں کوئی بیج ہو۔ آپ نے دیکھ ہی لیا ہے۔ یہاں کا تاجر ہو، یہاں کا فیوڈل لارڈ ہو، وہ استاد کے رتبے کے پیچھے اسی طرح چلتا ہے، جیسے روم کے دنوں میں غلام اپنے آقا کے پیچھے چلتے تھے۔ مالی طور پر وہ بھی بے چارے ہیں۔ یہی ان کا کمال ہے کہ مالی طور پر کمتر ہیں، لیکن رتبے کے اعتبار سے بہت اونچے ہیں جیسے سقراط جو تھا، وہ اپنے کھنڈروں میں اور فورم میں کھڑا ہو کے ننگے پاؤں بات کرتا تھا لیکن اس کا احترام تھا وہ کوئی امیر آدمی نہیں تھا۔

(ٹی وی پروگرام 'زاویہ' سے لیا گیا)

☆.....☆.....☆

ہم آپ کے فرمان کے مطابق مجبور ہیں۔ عدالت نے جو ضابطہ قائم کیا ہے، اس کے تحت آپ کو چیک کریں، باوجود اس کے کہ ہمیں اس بات کی شرمندگی ہے اور ہم بے حد افسردہ کہ ہم ایک استاد کو جس سے محترم اور کوئی نہیں ہوتا، اپنی عدالت میں ٹرائل کر رہے ہیں اور یہ کسی بھی جج کے لئے انتہائی تکلیف دہ موقع ہے کہ کورٹ میں، کٹہرے میں ایک استاد مکرم ہو اور اس سے ٹرائل کیا جائے۔ اب میں شرمندہ اپنی جگہ پر یا اللہ یہ کیا شروع ہو رہا ہے۔ میں نے کہا، حضور جو بھی آپ کا قانون ہے، علم یا جیسے کیسے بھی آپ کا ضابطہ ہے، اس کے مطابق کریں، میں حاضر ہوں۔ تو انہوں نے کہا، ہم نہایت شرمندگی کے ساتھ اور نہایت دکھ کے ساتھ اور گہرے الم کے ساتھ آپ کو ڈبل جرمانہ کرتے ہیں۔ ڈیڑھ روپیہ ہو گیا۔ اب جب میں اٹھ کے اس کرسی میں سے اس کٹہرے میں سے نکل کر شرمندہ، باہر نکلنے کی کوششیں کر رہا تھا۔ وہ جو جج، اس کا عملہ تھا، اس کے منشی تھے، وہ سارے جناب میرے پیچھے پیچھے جا رہے تھے کہ ہم احترام فائقہ کے ساتھ آپ کو رخصت کرتے ہیں۔ میں کہوں، میری جان چھوڑیں۔ یہ باہر نکل کر میرے ساتھ کیا کریں گے۔ آگے تک میری موٹر تک مجھے چھوڑ کر آئے۔ جب تک میں وہاں سے سٹارٹ نہیں ہو گیا، وہ عملہ وہاں پر ایسے ہی کھڑا تھا۔ اب میں لوٹ کے آیا تو میں سمجھا یا اللہ میں بڑا معزز آدمی ہوں اور محلے والوں کو بھی آکر بتایا کہ میں ایسے گیا تھا اور وہاں پر یہ یہ ہوا۔ وہ بھی جناب، اور میری جولیڈ لیڈی تھی، وہ بھی بڑی خوشی کے ساتھ محلے میں چوڑی ہو کے گھوم رہی تھی کہ دیکھو ہمارا بیٹا بچر گیا، اور کورٹ نے اتنی عزت کی۔ اس کی عزت افزائی ہوئی تو میں یہ سمجھا کہ اس کے ساتھ ساتھ میری تنخواہ میں بھی اضافہ ہوگا، دیسی آدمی جو ہے نا وہ چاہے ٹیچر بھی ہو، وہ گریڈ کا ضرور سوچے گا۔ کتنی بھی آپ عزت دے دیں، کتنا بھی احترام دے دیں، وہ پھر بھی ضرور سوچے گا کہ مجھے کہیں سے چار پیسے بھی ملیں گے کہ نہیں، میں نے اپنے ریکٹر سے پوچھا، تو اس نے کہا، نہیں تنخواہ یہاں پروفیسر کی اتنی ہی ہے جتنی تمہارے پاکستان میں ہے۔ وہ کوئی مالی طور پر اتنے بڑے نہیں ہیں، لیکن عزت کے اعتبار سے بہت بڑے ہیں۔ رتبہ ان کا بہت زیادہ ہے، اور کوئی شخص یہاں کوئی

میری لائبریری سے

”میں فرشتہ نہیں ہوں انسان ہوں۔ رویے بہر حال تکلیف دہ ہی ہوتے ہیں۔ لیکن تم بتاؤ میکے میں کیا کبھی اونچ نیچ یا کسی سے تلخ کلامی نہیں ہوتی؟ کیا وہاں پر سب اچھا ملتا ہے؟ اگر وہاں مختلف مزاج ہیں تو یہاں بھی برداشت کرو۔“ یہ دوستوں کا مکالمہ ہے۔

اپنے ارد گرد آباد اپنے ملک کی یا فلسطین، کشمیر، شام اور عراق کی اُن دکھیا کالونیوں کے چکر ضرور لگانا جو اپنے ایمان کی گواہی کے لئے جدوجہد کر رہے ہیں۔ جن کی عزتوں کو لوٹا جا رہا ہے، زمین ان پر تنگ ہو گئی ہے۔ ہجرت مزید ہجرت نے اس پوری روئے ارضی کو ان کا مسکن بنا دیا ہے۔ کبھی غزہ کی دکھیا کالونی کا چکر ضرور لگانا جہاں اسرائیلیوں نے معصوم بے گناہ شہریوں پر زندگی حرام کر دی ہے۔ جہاں درندے بھی پناہ مانگتے ہیں۔ جہاں کی زمین ظلم کے بوجھ سے پھٹنے کو ہے۔ مجھے اُمید ہے تم ان ساس نندوں، عزیز واقارب کے غموں سے بے نیاز ہو جاؤ گی۔“

”رجل رشید“ اکل حلال پر خوبصورت افسانہ ہے ساتھ ہی عورتوں کا حق وراثت ادا نہ کرنے والوں کو وعید بھی سنارہا ہے۔ ایک ہی جملہ لکھ دینا کافی ہوگا۔ ”اتنا واضح حرام..... بہنوں کا حق جہاں مارا جائے وہاں رب کیسے راضی ہوتا ہوگا؟“

”وعید پیش“ دلنشین انداز میں انسان کو حالات سے مایوس ہونے کے بجائے کوشش و محنت کی ترغیب دلا رہا ہے۔

”در رحمت“ عنوان ہی متوجہ کرنے والا ہے۔ کیا خوب جاندار کردار ہیں افسانے کے، ایک ڈرامے کی طرح سارے مناظر نظروں کے سامنے سے گزرتے محسوس ہوتے ہیں۔ رزق حلال کی تاکید، توکل علی اللہ، رشتہ کے انتخاب کی بنیاد، عصر حاضر کی پریشانیوں سے نجات کے قیمتی نسخہ کا حسین امتزاج، یہ افسانہ 23 صفحات پر مشتمل

نام کتاب: روشنی ہے رستہ

مصنفہ: قانتہ رابعہ

پبلشر: البدر پبلی کیشنز، اردو بازار لاہور

رابطہ نمبر: 042-37225030

یہ کتاب ایسی شخصیت کی تصنیف ہے جس سے ماہنامہ بتول کے قارئین بخوبی واقف ہیں ہر ماہ جب ماہنامہ بتول ہاتھ میں آتا ہے تو ادارے کے فوراً بعد میں قانتہ رابعہ کا افسانہ پڑھتی ہوں۔ زیر نظر کتاب (روشنی ہے رستہ) افسانوں پر مبنی ہے اور نوجوان نسل خصوصاً لڑکیوں کے لئے قانتہ رابعہ کی بہترین کاوش ہے۔ چھوٹے چھوٹے پُر معنی جملے، دلچسپ انداز، پڑھنے والا اکتاتا نہیں۔ کردار جاندار ہیں، ہر افسانہ اختتام تک پہنچتے پہنچتے غیر محسوس انداز میں کوئی مثبت پیغام دے جاتا ہے۔

27 افسانوں پر مشتمل اس کتاب کا ٹائٹل خوبصورت اور گیٹ اپ اچھا ہے۔ دودھ جیسے سفید صفحات۔ کتاب دیکھ کر ہی پڑھنے کو دل چاہتا ہے۔ ”مصلحت“ عنوان کے تحت چھوٹی سی کہانی کا پلاٹ اس نکتے کے گرد بٹنا گیا ہے کہ بندے کا اگر کوئی کام نہ ہو پائے تو اس میں اس کی کوئی بہتری پوشیدہ ہوتی ہے جس کا احساس اسے اکثر بعد میں ہوتا ہے۔ ”دکھیا کالونی“ میں بتاتی ہیں کہ دنیا کے چھوٹے چھوٹے دکھ خصوصاً عورتوں کے لئے ساس نندوں کے رویوں کا دکھ جو انہیں اکثر غمزدہ کئے رکھتا ہے بہت معمولی حیثیت رکھتا ہے۔ لکھتی ہیں:

”دوست ہم خود منتخب کرتے ہیں اپنے ذوق اور مزاج کے مطابق جبکہ رشتہ درد ہمیں تقدیر دیتی ہے۔ مختلف مزاجوں اور طور اطوار کے مالک!“

”پھر بھی دکھ تو ہوتا ہوگا رویے تو بہر حال تکلیف دہ ہیں۔“

کیجئے۔

”جسٹ جو کنگ“ دو چھوٹی کہانیاں، جو سوچنے پر اُکساتی ہیں، نئے فیصلوں کی راہ دکھاتی ہیں۔

”حصار“ جتنا مضبوط ماں کا رشتہ اولاد کے ساتھ، اتنا ہی مضبوط اس کا حصار۔ دنیا ٹھیک کہتی ہے ”مائیں زندہ ہوتی ہیں تو آس پاس ہوتی ہیں۔ مرنے کے بعد دلوں کے اندر آسستی ہیں۔“
آئیے اب نئے نبی کے سچے موتیوں سے اپنی آنکھوں کو طراوت پہنچائیں جو قاتلہ رابعہ کے قلم میں اس کتاب میں صفحہ قرطاس پر بکھیرے ہیں۔

”وہ کیسی من موہنی صورت تھی جسے اللہ نے روشن چراغ کہا۔ جس کے چہرہ کی چمک سے چاند جگمگاتا ہے۔ جس کے ابروؤں سے ہلال صورت تراشتا ہے۔ جس کی مسکراہٹ سے کلیوں نے مسکرانا سیکھا۔ جس کی گفتگو سے بلبل و مینا نے نغمے گائے، جس کے لفظوں سے ہدایت کے چراغ جلتے ہیں۔ وہ جس کی آنکھوں کی پتلیوں سے رات سیاہی پکڑتی ہے وہ جس کے دانتوں کی چمک سے ہیرا چمکتا ہے۔ وہ جس کے جمال سے باد نسیم چلتی ہے، وہ جس کے جلال سے بجلیاں کڑکتی ہیں، وہ ماہ مہر تاباں جس سے بڑھ کر کسی ماں نے حسین بچہ نہ جنا۔ وہ شاہِ لولاک جسے الم نشرح لک صدرک کا تمغہ رب ذوالجلال نے دیا۔“

☆.....☆.....☆

ہے۔ ”حلال کمائی میں ایثار، محبت، وفاداری آٹے میں نمک کی طرح ملے ہوئے ہیں۔“ ”اللہ تمہاری اور میری توقع سے زیادہ رحیم ہے۔ غلطی کا احساس ہو جانا بھی اس کی رحمت ہے۔ تم ایک دفعہ اس کے در پر مانگ کر تودیکھو وہ کتنے خیر کے دروازے اور کھولے گا۔“

”خدا نے بندے کے دو کام رزق اور رشتے اپنے ذمے لے کر بندے کو ٹینشن فری کر دیا ہے۔ اللہ کو بہت اعتقاد کے ساتھ رب انی لما انزلت الی من خیر فقیر..... کی درخواست پیش کر دی ہے۔ مجھے یقین ہے میرا رب مجھے خیر ہی خیر دے گا۔“..... ”یار تو بہ کا دروازہ تو سب کے لئے کھلا ہے..... احساسِ ندامت ہی آدمیت کی پہچان ہے..... دوسرا بلنڈ رتم نے یہ کیا کہ دنیا کی چکا چونڈ دیکھی۔ ایک شریف کی حیا سے منہ موڑا تو دنیا جہان کی بے حیائی اور بدکاری تمہارے پلے پڑ گئی..... تیسرا یہ کہ تم نے دین کی وجہ سے رشتہ ٹھکرا دیا۔ دین نے تمہیں کیسے ٹھکرایا؟“

”یہی زندگی ہے“ ایک چھوٹی سی کہانی ہے زندگی کی بے ثباتی کا یقین دلانے کے لئے۔ ”رکاوٹ“ خواتین کا اپنی ستائش کرنے اور دوسروں کو کمتر سمجھنے کا رویہ دکھا رہا ہے۔ ”رحمت سے زحمت“ بیماری کے پردے میں مریض کو اللہ تعالیٰ کا قرب نصیب ہوتا ہے۔ اس کے گناہ معاف ہوتے ہیں اور دعائیں قبول ہوتی ہیں۔

”جوگ“ میرا اللہ تو بہ اور ہدایت طلب کرنے کی دعا کبھی رد نہیں کرتا۔ بندے کی توبہ اور ہدایت کی طرف پلٹنے کے لئے متوجہ رہتا ہے۔“ کتنے دلکش انداز میں دین کا ایک ذریعہ اصول سمجھا دیا ہے۔

”جمالِ فن تیرا کم نہ ہو“ ملازموں سے ہمارے رویوں کا عکاس ہے۔ ”کسبِ کمال گن“ اللہ کرے ہم بھی ویسا کسبِ کمال کر سکیں جو عبدالقدیر اور اس کی بیوی نے کیا۔ آپ خود پڑھیں اور جانیں۔

”سند“ میں اس اصول سے مکمل اتفاق کرتی ہوں کہ اللہ کی راہ میں خلوص سے پیش کیا ہوا تحفہ یقیناً کئی گنا بہتر صورت میں واپس ملتا ہے خواہ اس دنیا میں ملے یا آخرت میں۔ افسانہ پڑھیے اور فیصلہ

حسن سے محبت انتہائی فطری ہے۔ انسان کی بے شمار نفسیاتی جس اس سے تسکین پاتی ہے لیکن محدودیت سوچوں پر قبضہ کر لے تو محض منفی اور بگاڑ زدہ معاشرہ وجود میں آتا ہے بالکل وہی معاشرہ جو عمومی سطح پر ہمارا منہ چکا ہے۔

اللہ کا فرمان ہے ”جس نے ایک آدمی کو قتل کیا گویا اس نے پوری انسانیت کو قتل کر ڈالا“ ہمارے ذاتی خیالات کے نازیبا اشتہارات، ہمارے تبصروں، نگاہوں کے انداز، حرکات و سکنات کتنے لوگوں کو محض اس لئے شر سے خیر کی طرف منتقل نہیں ہونے دیتے کیونکہ ان کے باعث وہ حسن کے محدود تصور کے مطابق خود کو ڈھالنے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔ ان کے کسی اونچے آدرش کو اپنانے کے امکان کو ختم کر کے ہم ان کا روحانی قتل کر ڈالتے ہیں۔ یوں ان ”مقتولین“ کی زندگیاں بلند مقاصد کے بجائے محض خلق خدا کو مرعوب کرتے رہنے کی کیفیت میں گزر جاتی ہیں۔

انسان فطری طور اپنے ارد گرد کی دنیا سے سند قبولیت کا حاجت مند ہوتا ہے۔ لیکن ریبپ پر چلنے والی ماڈلز کو معیار بنالینے سے انسانوں کے وسائل ”سائل“ پر خرچ ہونے کے بجائے سیکہ کو کترینہ بنانے پر صرف ہو رہے ہیں۔ چاہے کوشش عبث ہی رہے لیکن توانائیوں کا رخ بہر حال اس طرف ضرور کیا جاتا ہے۔ مادی و فکری وہ خزانے جو کسی فلاح و خیر کے کام پر خرچ ہوتے اور انسان کو مادی و روحانی ترقی کے نت نئے انداز سے روشناس کراتے، محض ماہ جہیں اور پری و ش کی تخلیق میں کھپ جاتے ہیں۔

حسن و جمال کی ضرورت ہر معاملہ میں ہے، لیکن پرفیوم کی بوتل کی عمدہ اور دیدہ زیب پیکنگ پر ہی پوری توجہ صرف کر دینا اس کی کواٹری پر کوئی بھی اثر نہیں ڈالے گا۔ ایک بار پیکنگ ہاتھ میں آتے ہی سارا معاملہ خوشبو کی عمدگی پر منحصر ہو جاتا ہے۔ پیکنگ کا عمدہ ہونا بس اس حد تک ضروری تھا کہ وہ خوشبو سے دنیا کو آگاہ کر دے، گلاب، گلاب لگے کیکر نہیں۔ لیکن اگر گلاب کے اندر سے کیکر نکل آئے تو؟

کیا ہی اچھا ہو کہ کمال و جمال کے معیارات کو، ”کی ہول“ میں دیکھ کر اپنانے کے بجائے کھلے اور بلند بالا دریچوں سے دیکھ کر قائم کیا جائے!

☆.....☆.....☆

سٹیج پر بیٹھے اس وجود کا بے شمار آنکھوں نے کتنے ہی زاویوں اور خطوط سے جائزہ لیا۔ انگلیوں کے ناخن سے بیضی چہرے تک، ہر تاثر اور ہر سجاوٹ کو نوٹ کیا گیا اور پھر یہ طے پایا کہ ”دلہن بس عام سی ہے، کوئی بھی خاص نہیں۔“

”نہ جانے بیگم خالد فیملی نے اتنی عمومی لڑکی کا انتخاب کیوں کیا جو دلہن بنی بھی حسین نہیں لگ رہی..... ورنہ میک اپ آرٹ تو معمولی مین نقش کو بھی شاہکار میں تبدیل کر دیتا ہے۔“

”لگتا ہے پارلر کوئی غیر معیاری ہوگا ورنہ بیگم خالد کے بھانجے کی بیوی دیکھو کس قدر حسین لگ رہی ہے..... کتنی مہارت سے میک اپ کیا گیا ہے کہ چوڑا چہرہ بھی ماڈلز کا سا لگ رہا ہے۔“

”ہاں پچھلے ہفتے اس کی بھی شادی ہوئی ہے..... ہر روز پری ہی لگی، سوائے ایک دن کے..... جب وداع کی اگلی صبح اس نے خود میک اپ کیا تو پول کھل گیا۔“ کوئی تبصرے سے تبصرے تھے!

”اس سے تو لاکھ اچھی میری موہنی تھی۔ اسمارٹ سرو قد اور چمکتی رنگت بیگم رضانا چوٹی بار اپنی نشست پر بیٹھے بیٹھے سامنے سٹیج سے نظر آتی دلہن کا تجزیہ کرتے سوچا۔ حالانکہ موہنی کی شادی ہوئے سال بیت چکا تھا ”کیا ہی اچھا ہوتا کہ بیگم خالد کے ہاں اس کا رشتہ ہوتا!“ سرد آہ ان کے لبوں پر دوڑ گئی۔

اس تقریب میں اور تقریب کے بعد شرکت سے محروم رہ جانے والوں کے درمیان اولین سوال شادی کے حوالے سے خاصہ عرصہ تک یہی تھا۔ ”دلہن کیسی ہے؟“ اور اس کے ساتھ جواب کم و بیش ان الفاظ کے ساتھ ”قسمت کی دھنی ہے بھئی ورنہ بس عام سی شکل کی لڑکی ہے۔“

دلہن پر کیے گئے تبصروں کو مرتب کرنے کا رب العالمین اگر کوئی بندوبست کر دیتا تو پڑھنے والے کے ذہن میں کسی ایسی مخلوق کا تاثر بنتا جسے نہ دل کی قبولیت ملنی ممکن تھی اور نہ دماغ کی سند منظوری۔ ایسا حیران کن واقعہ، جیسے سائنس سے نابلد لوگوں کے لئے آگ کا خلا میں نہ جلنا۔ ایسی کچھ عجوبہ تخلیق رب نہ تھی وہ..... بس یہ تھا کہ اپسرا نہ تھی۔ ہر ایک اپسرا ہوتی بھی نہیں ہر ایک اپسرا ہوتی تو اپسرا، اپسرا ہی نہ رہتی۔ اپسرا کو آسمان پر چڑھانے میں ان غیر اپسراؤں کا کمال ہے جو ارد گرد موجود ہو کر اس کو نمایاں کرتی ہیں۔ جیسے رات کی سیاہ چادر نہ تھے تو چاندنی سا چاند نہ چمکے۔

بتول میگزین

بھری گود

شاہدہ اکرام

تاریخ کی ککھ کبھی بانجھ نہیں رہی اور نہ ہی پوری کبھی شیطان کی جھولی میں گئی ہے۔ ایسے ایسے بطل جلیل پیدا ہوتے رہے جن پر تاریخ کو بجا طور پر فخر ہے۔ بگاڑ کو سنوارنے سے بدلنے والے اپنا فرض تندہی سے ادا کرتے رہے۔ تاریخ کی تحریک محسوس رہی۔ دیے سے دیا جلتا رہا۔ ایک کے بعد دوسرا دوسرے کے بعد تیسرا..... پھر چوتھا..... سفر جاری رہا۔

نیکی اور بدی کی کشمکش روزِ اول سے جاری ہے۔ اس کا آغاز تو تخلیق آدم کے موقع پر ہی ہو گیا تھا جب شیطان نے یہ کہہ دیا تھا کہ میں نہیں سجدہ کرتا جس کو تو کہتا ہے۔ احساس برتری، خود پرستی، انا اور نفسانیت کا بت تو پہلے روز ہی وجود میں آ گیا تھا۔ اس کی ابتدا اصلی شیطان نے کی تھی بعد میں اس کے پیروکاروں نے سینکڑوں، ہزاروں بُت خانے تعمیر کر ڈالے۔ جن میں ہر رنگ کا بت سجا کر رکھ دیا گیا اور خدائے واحد کو چھوڑ کر ان لاتعداد بتوں کو سجدہ کیا جانے لگا۔

لیکن ہر دور میں ابراہیم اور موسیٰ بھی پیدا ہوتے رہے۔ جنہوں نے بت خانوں میں اذانیں دیں۔ فرعونوں کی اکڑی گردنیں خم کیں اور تاریخ کو منور کیا۔

عشق الہی، آتش نمرود کو گل و گلزار بناتا رہا۔ ضربِ کلیسی وقت کے فرعونوں کو موت کی نیند سلاتی رہی۔ انسانیت کے نجات دہندہ آبلہ پا ہوئے۔ آگ میں ڈالے گئے مگر آزمانش کی بھٹیاں انھیں کندن بنا کر نکالتی رہیں۔ وقت کی تاریکیاں اس نورِ حق سے منہ چھپاتی رہیں۔ نشانِ لہو ابھی ہوئے مگر شوقِ منزل سب کچھ ہنس کر سہہ گیا۔

عشق بڑھتا رہا سوئے دار و سن زخم کھاتا ہوا مسکراتا ہوا راستہ روکتے روکتے تھک گئے، زندگی کے بدلتے ہوئے زاویے

سیاہ رات، مہیب تر رات محبوب کی کہانیاں سناتے گزر گئی۔ منانے والا، بھیجنے والا، عطا کرنے والا، اپنے پاس بلانے والا راضی ہو جائے۔ ہر وانِ شوق کا یہی مطلوب و مقصود رہا یہی سودائے زندگی رہا۔ چشمِ فلک نے دیکھا کہ وقت ایسے بے شمار فرزندِ انِ شوق زمانے کے حوالے کرتا رہا۔ قافلہ بڑھتا رہا۔ تاریخ تہمتی رہی۔

اپنے سروں میں خود سری اور کبر کا کیڑا رکھنے والے زمانے کے فرعون سن لیں کہ تاریخ کی گود کل بھی ایسے فرزانوں سے خالی نہ تھی اور آج بھی بھری ہوئی ہے جو تاریخ کو بدل دینے کی اہلیت بھی رکھتے ہیں اور ایسے تمام فرعونوں کی موت کا پیغام بھی ہیں جو نشۂ اقتدار میں مست، انجام سے بے خبر اور تاریخ سے نابلد خوش فہمیوں اور غلط فہمیوں میں مبتلا ہیں، اسلام کو نیچا دکھانے کے ناپاک عزائم رکھنے والے سن لیں کہ اسلامی تاریخ کی یہ بھری گود ہے اور ان شاء اللہ بھری رہے گی۔

☆.....☆.....☆

دعا

ڈاکٹر گلشن حقیق مرزا

الہی پھر دلوں کو پاک کر ایمان پیدا کر
بڑھے جوشِ اخوت جس سے وہ سامان پیدا کر
نہیٰ محترم کی پیروی ہی اپنا مسلک ہو
ہمارے ہر عمل میں مومنانہ شان پیدا کر
تیرا کلمہ ہی دل میں ہو، یہی وردِ زبان ٹھہرے
جو تیرے نام پہ مٹ جائیں وہ انسان پیدا کر

☆.....☆.....☆

رخسانہ کوثر۔ وہاڑی

قائد اعظم سے جب کسی نے پوچھا کہ پاکستان کا دستور و قانون کیا ہوگا؟ جواب دیا: ”جو مدینہ منورہ کی ریاست کا تھا وہی قانون ہمارا ہوگا۔“ ہم خوش نصیب کہ ”مدینہ النبی“ سے ہماری نسبت ہے۔

آج بعض لوگ کہتے ہیں کہ پاکستان معاشی مفادات اور روزگار کے حصول کیلئے بنا تھا۔ کیا عالمی تاریخ کی سب سے بڑی ہجرت (پاکستان) محض نوکریوں کے حصول کے لیے ہوئی تھی؟ لاکھوں عصمتیں لھیں، لاکھوں گھر جلے، لاکھوں لوگ شہید ہوئے۔ نانی جان کو اللہ غریقِ رحمت کرے جب پاکستان بننے کی داستان سناتی تھیں تو کلیجہ پھٹنے لگتا تھا ایسا لگتا تھا کہ ہم اپنی آنکھوں سے وہ منظر دیکھ رہے ہوں کیسے نانا جان کو، ہندوؤں نے شہید کر دیا۔ نانی کی حالت حمل، پھر بیوگی کا غم، اوپر سے بے وطنی، کتنے غم کے پہاڑ تھے جو ان پر ٹوٹے اور میری امی پیدا ہونے سے پہلے ہی یتیم ہو چکی تھیں۔ باپ کے پیار کے لمس کی آج بھی ان کو حسرت ہے۔

اتنی عظیم تحریک، اتنے عظیم جذبے، اتنی عظیم منزل، اتنی عظیم قیادت کی قدر و قیمت آج ہمیں معلوم ہے؟

قائد اعظم کی اہلیہ کا تعلق ارب پتی مجوسی خاندان سے تھا۔ ’رقن بائی‘ سے شادی کے وقت ان کو مسلمان کیا، کلمہ پڑھوایا پھر بیوی بنایا۔ ان سے ایک بیٹی ’دینا‘ پیدا ہوئی۔ تھوڑے عرصے بعد بیوی فوت ہو گئی چونکہ قائد اعظم دن رات پاکستان بنانے کی جدوجہد میں مصروف تھے۔ بیٹی نکھیاں رہتی تھی۔ ایک آتش پرست نوجوان سے شادی کرنے کی بات اپنے بابا سے کر بیٹھی، اکلوتی اولاد، بے حد پیاری بیٹی مگر قائد نے ناراض ہو کر اس سے ناثیم کر لیا۔

نبی اکرم ﷺ نے فرمایا: ”کافر مسلمان کا وارث نہیں اور مسلمان کافر کا وارث نہیں۔“ قائد اعظم نے اس فرمان پر بھی عمل کر کے دکھایا۔ اپنی بیٹی کو ایک پائی تک نہ دی۔ اپنی ساری جائیداد پاکستان کو دے دی۔ انڈیا کے شہر بمبئی میں قائد اعظم کی بیش قیمت کوٹھی تھی وہ بھی آپ نے پاکستان کو دے دی۔ وہ پاکستان جو اللہ کے نام پر بنا۔ یہ الگ بات ہے کہ ہندوؤں نے وہ کوٹھی اپنے قبضے میں لے لی۔ قائد اعظم کے رشتے دار

کرائے کے مکانوں میں رہتے رہے۔ قائد اعظم دوقومی نظریے پر عمل کر کے دکھا گئے کہ ”مسلمان اور ہندو دو الگ الگ قومیں ہیں کہ گائے جس کو ہندو اپنی ماتا (ماں) کہہ کر پوجا کرتا ہے، اس کا پیشاب پیتے ہیں لیکن مسلمان اسے کھاتے ہیں لہذا یہ دو الگ قومیں ہیں۔“

علامہ اقبال نے اپنے خط (28 مئی 1937ء) میں قائد اعظم کے نام لکھا مسلمانوں کے معاشی مسائل اور روزگار کا علاج شریعت میں موجود ہے لیکن جب تک ہمارے پاس آزاد ملک موجود نہ ہو ہم شریعت نافذ نہیں کر سکتے۔

قائد اعظم نے قیام پاکستان سے قبل 101 مرتبہ اوقیام پاکستان کے بعد 14 مرتبہ کہا کہ پاکستان کے نظام کی بنیاد اسلامی اصولوں پر استوار کی جائے گی (روزنامہ جنگ، ڈاکٹر صفدر محمود کے کالم 3 مئی 2015ء سے ماخوذ)

قوم نے قربانیاں دیں تو قائد نے بھی قربانیاں دیں۔ بیٹی کی قربانی (کہ اسلام اور پاکستان کے لئے تعلق ختم کر لیا) جائیداد کی قربانی، صحت کی قربانی (جب فوت ہوئے تو وزن صرف 22 کلو تھا)

آج کے سیاستدان، حکمران ڈالروں کے بدلے قوم کو بیچتے ہیں، اولادیں اور جائیداد، یہاں تک کہ رہائش بھی سوئٹزر لینڈ، امریکہ میں رکھتے ہیں اور قائد پاکستان میں کہلاتے ہیں۔ ایک وزیر نے قائد اعظم سے گورنر ہاؤس میں سرکاری ملاقات کی۔ ملاقات کے بعد جب کمرے سے نکلے تو قائد اعظم نے کمرے کی لائٹ آف کر دی۔ پوچھا کہ آپ نے کمرے کی لائٹ بند کر دی جواب دیا، ابھی جب تم برآمدے سے نکل جاؤ گے تو اس کی بھی لائٹ بند کر دوں گا کہ اس کا بل سرکاری خزانے سے جاتا ہے۔

پاکستان کی پہلی کابینہ کا اجلاس تھا اے ڈی سی گل حسن نے قائد سے پوچھا: ”سرا اجلاس میں چائے سرو کی جائے یا کافی قائد نے چونک کر سر اٹھایا اور فرمایا: ”یہ لوگ گھروں سے چائے یا کافی پی کر نہیں آئے؟“ اے ڈی سی گھبرا گیا قائد نے کہا ”جس وزیر نے چائے کافی پینی ہو وہ گھر سے پی کر آئے یا پھر گھر واپس جا کر پیئے۔ قوم کا پیسہ قوم کے لئے ہے وزیروں کے لئے نہیں۔“

اس کے بعد قائد اعظم جب تک گورنر جنرل رہے کابینہ کے اجلاس میں سادہ پانی کے سوا کچھ سر نہیں کیا گیا۔ ☆☆

کرمز دوری کرتا ہے اور کسی نے اپنے کندھوں پر ڈگریوں کے اوزار سجا رکھے ہیں۔ سب اپنے اپنے مفاد کے لئے محنت مشقت میں مصروف ہیں۔ کوئی جسمانی مشقت میں مبتلا ہے کوئی ذہنی مشقت میں۔ کوئی کسی کا نوکر ہے نہ غلام کسی کا خدمت گار نہ فرمانبردار۔ سب اپنے ’پیٹ‘ کے نوکر اور غلام ہیں۔ سب اپنے خود خدمت گار اور اپنے نفس کے فرمانبردار ہیں۔ سارا دن دوسروں کی خدمت کر کے جان کھپانے والے نوکر اور خدمت گار کسی امیر انسان اور صاحب حیثیت و اقتدار کے خدمت گار نہیں ہوتے، یہ محض پیسے والوں کی ان کی تسکین ہے کہ ہمارے اتنے نوکر ہیں۔ وہ سب خدمتیں نوکروں کی اپنے پیٹ اور اپنی ضروریات کی خاطر ہوتی ہیں۔ اپنے مفاد کی خاطر ہوتی ہیں۔ جب ہر امیر غریب اپنے ہی پیٹ کا خدمت گار نوکر اور غلام ہے تو پھر انسانوں میں عزت اور توقیر کے پیمانے الگ الگ کیوں ہیں؟ دنیا علم کے بیش بہا خزانوں کے منہ کھول کر بھی اس نکتہ کو نہ پاسکی۔

ڈگریاں اور محقق اگر اس نکتہ کو نہ پاسکے تو پھر یہ علم کی بہتات تو نہ ہوئی۔ اس سارے کرہ میں علم کی نہیں معلومات کے جنگل کی بہتات ہوتی جارہی ہے۔ جس میں عقل و خرد گرم کردہ راہ ہوتی جارہی ہے۔ علوم کے خزانوں کے منہ کھل رہے ہیں۔ مگر یہ خزانے انسان کی بنیادی فکر اور سوچ کو پس پردہ لے جا رہے ہیں۔ معلومات کی فراوانی ہے جو اس مشین دور میں ہر لحظہ بڑھتی جارہی ہے۔ ایک سیلاب ہے جو ہر انسان کی سوچ کو بہا کر لے جا رہا ہے۔ اصل علم وہ ہے جس سے انسان اپنی حقیقت کو پہچانے اور شاید جس کے لئے ڈگریوں اور تحقیق کی ضرورت نہیں ہے۔ ایک گھر میں باغبان کی ضرورت تھی۔ صاحب خانہ نے ایک نوکری کے امیدوار باغبان سے پوچھا۔ ”بھی کیا تم کچھ پڑھے لکھے بھی ہو؟“

اس نے متانت سے جواب دیا۔ ”پڑھنا لکھنا تو الف، ب بھی نہیں آتا، بس زیر، زبر پیش کا پتہ ہے۔“

مالک مکان نے ایسی نظروں سے اُسے دیکھا جس میں استہزا کا رنگ نمایاں تھا اور اس سے سوال کیا کہ اچھا بتاؤ زیر، زبر، پیش کیا ہے؟ امیدوار نے اُسی سادگی سے بات جاری رکھی۔

”جی میں تو یہی جانتا ہوں کہ میری ذات زیر ہے، اللہ کی ذات زبر ہے

اور میں نے اس اللہ کی ذات کے سامنے پیش ہونا ہے۔“ ☆☆

انسان اور دیگر مخلوقات میں بنیادی امتیازات میں نمایاں امتیاز قوت افکار ہے۔ فکر اور سوچ ہی عمل کا پہلا زینہ ہے۔ اپنے حالات کو بہتر کرنے کے لئے، بہتر زندگی گزارنے کے لئے وہ سوچ اور فکر ہی سے کام لیتا ہے۔ پھر قوت گویائی ایک ایسا وصف ہے جو اس کے شرف کو مزید بڑھاتا ہے۔ علم کا حصول انسان کی شان ہے اور اسی شان کی بدولت وہ معاشرے میں بھی دوسروں سے ممتاز مقام حاصل کرتا ہے۔

مقام فکر یہ ہے کہ علم کی نوعیت کون سی ہے جو انسان کو شرف انسانی کے اعلیٰ مقام تک پہنچا سکتی ہے۔ آج دنیا میں علم کی ایسی جہتیں ہیں، ایسے شعبے ہیں، ایسے کمالات ہیں کہ خود انسانی عقل اپنے کارناموں پہ تعجب کرتی ہے اور فخر کرتی ہے کہ واہ! کیا علوم کے خزانے ہیں جو ہر روز اک نئے رُخ سے دنیا دکھ رہی ہے اور فرد ہو یا قوم، علم کے میدان میں ہر سو پیکار ہے۔ ہر شعبے میں ”سپیشلائزیشن“ ایک معیار بن گیا ہے۔ زندگی کا کوئی بھی میدان ہو ایک خاص علم اور ڈگری کا محتاج ہے اور اس کے بغیر کوئی اپنے آپ کو ”تعلیم یافتہ“ نہیں کہلا سکتا۔ اس کے علاوہ اپنی خاص صلاحیتوں کے ٹھکانے کی اس کو ہر قدم پر ضرورت پڑتی ہے۔

ہر روز کروڑوں لوگ مختلف مقامات پر اپنے علم، ڈگریوں اور صلاحیتوں کا جائزہ پیش کر رہے ہوتے ہیں۔ انٹرویو لینے اور دینے والے دونوں کے اپنے اپنے مقاصد ہوتے ہیں۔ بنیادی مقصد ایک ہی ہوتا ہے۔ ”اپنا مفاد“۔

یہ انسان کی بنیادی ضرورت بھی ہے اور کمزوری بھی۔ ہر انسان اپنی صلاحیتوں کو دوسرے کے ہاتھ فروخت کر رہا ہے اور بدلے میں اپنے مفاد کے لئے کچھ حاصل کر رہا ہے۔ گویا کہ سارا مقصد حیات حصول مفاد ہے اور ہر انسان خود متعین کرتا ہے کہ اُس نے اپنا کیا مفاد سوچ رکھا ہے۔

جسمانی طاقت کی صلاحیت والے مزدور کے سامنے ”دو وقت کی روٹی“ کا مفاد ہے۔ رات کو وہ اور گھر والے پیٹ میں روٹی کے چند نوالے ڈال کر سو گئے ہیں تو وہ اپنے مفاد کو حاصل کر لیتا ہے۔ اگلی صبح وہ اسی عمل کو دہرانے لگ جاتا ہے۔ نقد و نقد کا سودا ہے۔ وہ مزدور کسی بھی خطہ میں ہو اس کا یہی مقدر ہے اور اسی میں اس کا روزانہ کا مفاد ہے۔

ہیں تلخ بہت بندہ مزدور کے اوقات

تلخ اوقات تو ہر مزدور کے ہیں۔ ہر انسان ہی مزدور ہے۔ کوئی کرسی پر بیٹھ